محمود، فاروق، فرزانہ اور
انسپکٹر جمشید سیریز
ناول نمبر 12
Atlantis
Publications
پراسرار
پٹاخے
اشتیاق احمد

تفریح بھی، تربیت بھی

اٹلانٹس پبلیکیشنز صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول	پراسرار پتھر
نمبر	انسپکٹر جمشید سیریز نمبر 12
پبلشر	فاروق احمد
قیمت	35روپے

ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور رابطے کیلئے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

D-83 سائٹ، کراچی
فون: 2578273 - 2581720
e-mail: atlantis@cyber.net.pk

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"مومن، مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے......
جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط بناتا ہے۔"
پھر آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کرکے بتایا کہ یوں!

☆☆☆

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

☆ یہ وقت عبادت کا تو نہیں۔
☆ آپ کو اسکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
☆ آپ نے کسی کو وقت تو دے نہیں رکھا۔
☆ آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے عبادت اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔

اشتیاق احمد

السلام علیکم!

لیجیے اب پرانے بھی پراسرار ہونے لگے...... مگر اب کیوں...... یہ تو پینتیس سال پرانے ہیں...... اب ان میں چپ چپاتے اسرار شامل ہو گیا تو اس میں میرا کیا قصور...... اور پراسرار بھی اتنا ہی پرانا ہے......

ویسے دیکھا جائے تو آپ یہ ناول پراسراریت ہی کے لئے پڑھتے ہوں گے...... اگر ان ناولوں میں اسرار نہ ہو تو پرانے میں اور عام ناولوں میں کیا فرق رہ جائے گا...... کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں...... آپ تو خیر فوراً کہہ دیں گے...... جی بالکل ٹھیک...... لیکن بہرحال کچھ لوگ ہیں...... جو پراسرار ناولوں سے چڑتے ہیں...... جاسوسی ناول انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے...... ان کا خیال ہے...... جاسوسی ناول بھی کوئی پڑھنے کی چیز ہوتے ہیں...... ادھر اپنا حال یہ ہے کہ جس چیز میں پراسراریت کے جراثیم نہ ہوں...... وہ آگے چلتی ہی نہیں...... پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، پراسراریت نہ ہو تو بس چند سطریں پڑھ کر برا سا منہ بنا کر کتاب ایک طرف رکھ دیتا ہوں...... سچ بات یہ ہے یہ ناول پراسرار تھے...... تبھی تو مشہور ہوئے تھے...... اور اسی لئے تو آج ایک مدت بعد پھر سے ان کو شائع کیا جا رہا ہے...... ورنہ کون انہیں گھاس ڈالتا......

لیجیے دو باتیں پراسرار پرانے سے گھاس تک آ پہنچیں...... جب کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں...... گھاس میں سرے سے پراسراریت نہیں ہوتی...... ہاں کوئی جاسوسی ناول نگار چاہے تو اس میں بھی اسرار پیدا کرے...... جی ہاں اور کیا......

جیب کٹ گئی

ایک موٹا تازہ آدمی مون لائٹ ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر قیمتی سوٹ تھا۔ انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بھی بارعب تھا۔ ایک میز پر بیٹھتے ہوئے وہ دھاڑا:

"بیرا!" اس کی دھاڑ سے ہال کے سب لوگ اسے چونک کر دیکھنے لگے۔ دوسری میزوں کے بیرے بھی گھبرا گئے۔

اس میز کا غریب بیرا اس کی طرف دوڑا گیا:

"یس سر۔ یس سر!"

"تمہارا سر۔ کھانا لاؤ۔ جلدی۔"

"کیا لاؤں سر۔"

"سب چیزیں لے آؤ۔"

"جی!" بیرے کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔

"ہاں ہاں۔ جو جو پکا ہے، لے آؤ۔"

"اوکے سر!" بیرے نے کہا اور ہانپتا کانپتا چلا گیا۔

دس منٹ بعد ہی اس کی میز کھانے کی پلیٹوں سے بھر دی گئی اور وہ مر بھکوں کی طرح کھانے لگا۔ کئی لوگ ا حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ کھانے سے فارغ

ہوا۔ اس نے بدتمیزی سے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے پھر لاپروائی سے اٹھا اور واش بیسن کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے صابن سے ہاتھ دھوئے، منہ صاف کیا، واپس اپنی میز پر آیا۔ اور ایک بار پھر دہاڑا:

"بیرا!"

"لیس سر۔" بیرا قریب ہی موجود تھا۔ فوراً اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"بل لاؤ۔" اس نے کہا۔

بیرا گیا اور بل لے آیا۔ اس نے ایک نظر بل پر ڈالی، جیب میں سے پرس نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا اور پھر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے کرسی میں کسی بچھو نے اسے کاٹ کھایا ہو جیسے کرسی میں یک لخت بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے صاحب!" بیرے نے گھبرا کر پوچھا۔

"م۔۔۔میری۔۔۔میری۔۔۔ جب کٹ گئی۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیا۔ جیب کٹ گئی۔" ہال میں ہی آوازیں ابھریں۔

"ہاں۔ یہ دیکھو" اس نے کٹی ہوئی جیب الٹ کر دکھا دی۔ اس کا ہاتھ کٹی ہوئی جیب میں سے باہر نکلا ہوا تھا۔

"کیا آپ اس شہر میں اجنبی ہیں۔" بیرے نے پوچھا۔

"ہاں۔ آج ہی آیا ہوں۔ میرا تو سامان بھی ابھی تک اسٹیشن پر ہی پڑا ہے۔"

"اوہ۔ کیا آپ نے اسٹیشن پر لکھا ہوا بورڈ نہیں پڑھا تھا۔" بیرے نے پوچھا۔

"کیسا بورڈ!" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"اور کیا آپ نے اس ہوٹل کے باہر لکھا ہوا بورڈ بھی نہیں پڑھا۔" اس مرتبہ

بیرے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔ کیوں کیا بات ہے، ان بورڈوں پر کیا ہے۔"

"جناب۔ ان پر لکھا ہے کہ یہ اچکوں کا شہر ہے۔ اپنی جیب کی حفاظت کیجیے۔ اور اس ہوٹل کے بورڈ پر تو آگے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کھانے کے بعد آپ بل ادا نہ کر سکے (جیب کٹ جانے کی وجہ سے) تو بل آپ کی رسٹ واچ یا کوٹ اتار کر وصول کر لیا جائے گا۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" وہ پھر دہاڑا۔

"جناب۔ یہ بکواس نہیں ہے۔ یہ شہر واقعی اچکوں کا ہے۔ یہاں کسی کی جیب محفوظ نہیں۔ اکثر یہاں آنے والے گاہک جب آتے ہیں تو ان کی جیب کٹ چکی ہوتی ہے۔ اب ہوٹل کہاں تک نقصان برداشت کر سکتا ہے۔ یہاں تو ایسے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔"

"ہوں۔ تو اب مجھے رسٹ واچ اتار کر دینی ہوگی۔" اس نے بیرے کو گھورا۔

"مجبوری ہے جناب۔ رقم کی ادائیگی کے بعد آپ اپنی گھڑی واپس لے سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہوٹل کے مالک کو بلاؤ۔"

"وہ یہاں موجود نہیں ہوتے۔"

"اچھا تو منیجر کو بلاؤ۔"

"جی بہت بہتر۔"

بیرا گیا اور منیجر کو بلا لایا۔ یہ ایک نوجوان اور مضبوط آدمی تھا۔

"تم اس ہوٹل کے منیجر ہو۔" نوجوان نے شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا۔

"جی ہاں۔ بدقسمتی سے۔" اس نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

کیوں بدقسمتی سے کیوں؟" اجنبی مسکرایا۔ اس کا غصہ ایک دم غائب ہو گیا۔

"اچکوں کے شہر میں کسی ہوٹل کا منیجر ہونا بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی جیب کٹ گئی ہے۔"

"ہاں۔ بدقسمتی سے۔" اس نے مسکرا کر کہا جس پر منیجر کو بھی ہنسی آ گئی۔

"کتنی رقم تھی۔"

"اڑھائی ہزار۔"

"اوہ۔ مجھے افسوس ہے۔"

"اب میری گھڑی اتروانا چاہتے ہیں۔"

"مجبوری ہے۔"

"لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے۔" اجنبی نے کہا۔

"وہ کیا۔" منیجر نے خوش اخلاق لہجے میں کہا۔

"میرا سامان اسٹیشن پر پڑا ہے۔ یہ اس کی رسید ہے۔"

اس نے بیرونی جیب سے رسید نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ تو پھر۔"

"آپ اپنے کسی آدمی کو بھیج کر یہ سامان منگوا لیں۔ وہ ٹیکسی میں چلا جائے، میں ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا کروں گا۔ اس میں میرے کچھ اور پیسے ہیں۔ جن سے میں آپ کا بل ادا کروں گا۔"

"جی بہت بہتر۔ لایئے رسید۔ میں ابھی آپ کا سامان منگوائے دیتا ہوں۔"

"اور جب تک سامان نہیں آ جاتا، میں ضمانت کے طور پر یہیں بیٹھا رہوں گا۔" اجنبی نے کہا۔

"جی شکریہ!" منیجر نے مسکرا کر کہا اور چلا گیا۔

آدھ گھنٹے بعد اس کا سامان لے آیا گیا اور پھر اس نے بل ادا کیا۔

سامان بھی ہوٹل ہی میں جمع کرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ جانتے ہیں۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔" اس نے منیجر سے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ تھانے جا رہے ہوں گے۔" منیجر نے کہا۔

"تم نے ٹھیک سمجھا۔ اس کا مطلب ہے لوگ پہلے بھی تھانے جاتے رہتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ لیکن بنتا کچھ نہیں۔ آج تک ایک بھی اچکا گرفتار نہیں ہو سکا۔"

"لیکن اب تم دیکھنا۔ اس شہر میں بھونچال آتا ہے کہ نہیں۔ پولیس بھاگی بھاگی پھرتی ہے کہ نہیں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" منیجر نے چونک کر کہا۔

"بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔" اجنبی نے کہا اور ہوٹل سے نکل گیا۔

☆☆

دولت پور کے تھانے کا انچارج انسپکٹر ساجد دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ ان دنوں اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جس دن پندرہ بیس لوگوں کی جیبیں نہ کٹتی ہوں۔ وہ حیران تھا کہ یکایک شہر میں اتنے اچکے آ کہاں سے گئے۔ آج سے تین ماہ پہلے تو کبھی اس شہر میں کسی کی جیب نہیں کٹی تھی۔ کبھی کبھار چوری یا ڈاکے کا کیس ہو جاتا تھا۔ ایک دو کیس لڑائی جھگڑوں کے بھی ہوئے تھے۔ لیکن جیب کٹنے کے یہ کیس بالکل نئی چیز تھے۔

دولت پور ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا۔ جدید طرز پر بنایا گیا تھا۔ یہاں نئی طرز کے صاف ستھرے مکان ہوٹل اور سڑکیں کشادہ تھیں۔ رات کے وقت شہر رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگ کرتا۔ اس چھوٹے سے شہر میں انسپکٹر ساجد کی تعیناتی کو چھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن ان چھ سالوں میں مشکل ترین وقت اب آیا تھا۔ شہر میں جیب کتروں نے اودھم مچایا ہوا تھا اور ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ ایک جیب کترے کو بھی گرفتار نہیں کر سکا تھا۔ یہی بات اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ یہ کیسے اُچکے ہیں۔

آج بھی صبح سے نو آدمی رپورٹ درج کرانے آ چکے تھے۔ ابھی ابھی وہ نویں آدمی کی رپورٹ لکھ کر اور اسے دم دلاسا دے کر رخصت کر کے فارغ ہوا تھا اور سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد کی وجہ سے دھمک سی ہو رہی تھی کہ اسی وقت اجنبی اندر داخل ہوا:

"السلام وعلیکم"

"وعلیکم السلام! فرمایئے۔" انسپکٹر ساجد نے چونک کر کہا۔

"آپ ہی انسپکٹر ساجد ہیں۔"

"جی ہاں۔ بدقسمتی سے۔"

"بدقسمتی سے۔ کمال ہے۔ اس شہر میں جو بھی ملتا ہے یہی کہتا ہے۔" اجنبی نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں نے مون لائٹ ہوٹل کے منیجر سے یہ سوال کیا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ جی ہاں بدقسمتی سے۔"

"اوہ۔ سمجھا۔ خیر آپ فرمایئے کیسے تشریف لائے۔"

"میری جیب کٹ گئی ہے۔"

"جی!" انسپکٹر ساجد چلا اٹھا۔ "اُف خدا۔ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اجنبی سے پوچھا

"کیا عرض کروں۔ اس شہر میں نہ جانے کہاں سے اتنے اُچکے آ گئے ہیں. خیر آپ رپورٹ لکھوایئے۔"

"لیکن رپورٹ لکھنے سے پہلے کیا بنا ہے جواب بن سکے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ شاید ہوٹل کے منیجر نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"جی ہاں۔ سب کچھ۔"

"پھر بھی۔ رپورٹ تو آپ کو لکھوانی ہی پڑے گی۔"

"اچھا لکھئے۔" اجنبی نے کہا۔

"آپ کا نام۔" ساجد نے پوچھا۔

"پرویز اختر۔"

"باپ کا نام؟"

"اختر اعجاز۔"

"جی۔" انسپکٹر ساجد چونکا۔ کیونکہ یہ نام اُس کے ایس ایس پی صاحب کا تھا۔

"آپ چونک کیوں گئے۔ میں اس ضلعے کے ایس ایس پی کا لڑکا ہوں۔"

انسپکٹر ساجد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔

"آپ لکھتے لکھتے رُک کیوں گئے۔" پرویز اختر نے پوچھا۔

"آپ کب آئے۔ اور سیدھے میرے پاس کیوں نہیں آئے۔ ہوٹل جانے کی کیا ضرورت تھی۔" آخر ساجد نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"ابا جان کی ہدایت تو یہی تھی کہ میں آپ کے پاس ٹھہروں۔ خود میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں، پہلے میں ہوٹل چلا گیا۔ دراصل بھوک بہت لگ رہی تھی۔"

"اب میں آپ سے گزارش کروں گا۔" انسپکٹر ساجد نے کہا۔

"فرمائیے۔" پرویز اختر مسکرایا۔

"اپنی جیب کٹنے کی اطلاع انہیں نہ دیجئے گا۔"

"مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے۔ ابا جان نے بھی کہا تھا کہ آپ بہت فرض شناس ہیں۔ مگر میں حیران ہوں کہ یہاں اتنے اچکے کہاں سے آ گئے۔"

"میں خود حیران ہوں۔ اس سے پہلے تو کبھی لوگوں کی جیب نہیں کٹی تھیں۔"

"پھر..... اب آپ کیا کریں گے۔"

"کیا بتاؤں۔ یہی سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ یہ شہر تفریحی مقام بھی ہے۔ یہاں مال دار لوگ تفریح کے لیے آتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچ کر کوئی جیب کتروں کا گروہ یہاں آ گیا ہو....."

"ہاں۔ یہ ممکن ہے۔"

"میرے پاس یہاں اتنی پولیس بھی نہیں ہے کہ جگہ جگہ پہرے بٹھا دوں۔"

"ہوں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

"اب تو میں یہی سوچ رہا ہوں کہ اپنے دوست کو مدد کے لیے بلا لوں۔" انسپکٹر ساجد نے کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"انسپکٹر جمشید۔"

"انسپکٹر جمشید۔ یہ نام تو سنا ہوا ہے۔"

"جی ہاں۔ دارالحکومت میں محکمہ سراغ رسانی کے انسپکٹر جمشید سے کون واقف نہیں ہو گا۔"

"اوہ۔ اب میں سمجھا۔ بھئی ان کے تین بچوں کے نام بھی اکثر سننے میں آتے رہتے ہیں۔"

"بس بس۔ وہی۔"

"وہ آپ کا دوست ہے۔"

"جی ہاں۔"

"کیا وہ ان اچکوں کو پکڑ سکے گا۔"

"وہ بہت باصلاحیت آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔"

"تو پھر اسے بلا کر دیکھ لیں۔"

"جی ہاں۔ میں ابھی اسے تار دیتا ہوں۔" انسپکٹر ساجد نے کہا اور تار لکھنے لگا۔

☆☆☆

نوک جھونک

محمود اور فاروق گھر میں داخل ہوئے۔ فرزانہ اور بیگم جمشید صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ بیگم جمشید کوئی سویٹر بن رہی تھیں جب کہ فرزانہ کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ محمود نے فاروق کے کان میں سرگوشی کی:

"فرزانہ اس وقت ضرور کوئی ناول پڑھ رہی ہے۔"

"شاید تمہارا خیال ٹھیک ہی ہے۔"

"تو کیوں نہ چھاپہ مارا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔"

دونوں دبے پاؤں آگے بڑھے اس طرح کہ ان دونوں کو پتا نہ چلا اور وہ فرزانہ کے سر پر پہنچ گئے۔ پھر اچانک محمود جھکا اور فرزانہ کے ہاتھ میں سے ناول جھپٹ لیا۔

"ارے! یہ کیا۔ ہائیں تم دونوں کیسے اندر آ گئے شاید دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

ساتھ ہی وہ اٹھی اور محمود کی طرف جھپٹی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محمود کے ناول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا، لیکن محمود نے ایک دم ہاتھ اوپر کر لیا۔ فرزانہ چونکہ قد میں اس سے چھوٹی تھی اس لیے اس کا ہاتھ محمود کے ہاتھ تک نہ پہنچ سکا، وہ پنجوں کے بل کئی

بار اچھلی مگر ناول تک نہ پہنچ سکی کیونکہ ساتھ ہی محمود بھی اچھل رہا تھا۔

"یہ کیا۔ تم دونوں نے آتے ہی اودھم مچا دیا۔"

"امی جان! یہ دیکھیے فرزانہ ناول پڑھ رہی تھی۔ یہ رہا......"

"تو کیا ہوا۔ ان دنوں تم لوگ فارغ ہو۔ جو جی چاہے کرو۔ بچوں کے ناول پڑھنے میں کیا حرج ہے، بشرطیکہ اسکول کا کام کیا جا چکا ہو۔"

"تو گویا آپ ہمیں کھلی اجازت دے رہی ہیں۔" فاروق بولا۔

"ہاں ہاں۔ تم تینوں ان دنوں فارغ ہو نا۔"

"فاروق! ذرا کمرے سے دونوں ناول تو نکال لاؤ۔ ہم دونوں بھی یہیں بیٹھ کر پڑھیں گے۔" محمود نے کہا۔

"دیکھا امی جان۔ خود یہ دونوں بھی چھپے رستم ہیں۔ ان کے کمرے میں بھی ناول موجود ہیں۔" فرزانہ نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" بیگم جمشید مسکرائیں۔

ان کے سالانہ امتحان ہو چکے تھے۔ رزلٹ ابھی نہیں نکلا تھا۔ اس لیے آج کل انہیں اسکول سے چھٹیاں تھیں۔ وہ دونوں ابھی ابھی اپنے کسی دوست کے ہاں سے آ رہے تھے کہ آتے ہی فرزانہ سے جھڑپ ہو گئی۔

"اُچکے ہو پورے۔" فرزانہ نے محمود کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے اُچکا کہا تو ناول نہیں ملے گا۔" محمود نے دھمکی دی۔

"نہ ملے۔ میں پڑھ چکی ہوں۔" فرزانہ نے بے نیازی سے کہا۔

"اس لیے تم اُچکے ہی ہو۔"

"اور میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"تم بھی اس کے بھائی ہو۔"

"اور تم ہم دونوں کی بہن۔ یعنی اُچکی۔" فاروق کی بات پر محمود اور بیگم جمشید کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"لیکن۔ چھوٹی۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اچھا یہ لو اپنا ناول۔ ہمارے پاس اپنے موجود ہیں۔" محمود نے یہ کہہ کر ناول اونچا اُچھال دیا۔ فرزانہ اسے دبوچنے کے لیے لپکی لیکن اس سے پہلے فاروق ناول کو دبوچ چکا تھا۔

"دیکھا امی۔ دونوں مجھے تنگ کرنے پر تلے ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ کل تم تل جانا۔" فاروق نے تڑ سے کہا۔

"ہاں۔ تم بھی تو شیطان کی خالہ ہو۔ ہمیشہ ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑا بیٹھتی ہو۔" محمود بولا۔

"بھئی محمود۔ اب اسے زیادہ نہیں ستانا چاہیے۔ میں ناول اسے واپس دے رہا ہوں۔" فاروق نے شریر لہجے میں کہا۔

"لیکن ایک شرط پر۔" محمود بولا۔

"وہ کیا۔" فاروق نے پوچھا۔

"یہ آئندہ ہمارے کسی معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گی۔"

"کیوں فرزانہ۔ تمہیں یہ شرط منظور ہے۔" فاروق نے پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل منظور ہے۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

فاروق نے یہ سن کر ناول اسے پکڑا دیا۔ فرزانہ نے ناول لیا درمیان سے اسے کھولا اور پڑھنے لگی۔

"ارے! تم تو کہتی تھیں کہ پڑھ چکی ہو۔"

"تم سے ناول واپس لینے کے لیے یہ کہنا بہت ضروری تھا۔ ورنہ تم دونوں کبھی

نہ دیتے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"ہوں۔ تو ایک بار پھر تم ہمیں چکمہ دے گئیں۔" محمود نے گھور کر کہا۔

"اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں تمہارے معاملات میں آئندہ ٹانگ بے شک نہیں اڑاؤں گی کیونکہ وعدہ کر چکی ہوں۔ لیکن۔؟"

"لیکن کیا۔؟" دونوں ایک ساتھ جھنجھلا کر بولے۔

"اب میں تمہارے معاملات میں ہمیشہ پیر آڑا دیا کروں گی۔"

فرزانہ نے معصومیت سے کہا اور بیگم جمشید کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

دونوں اسے مارنے کے لیے جھپٹے۔ عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

"یہ دوپہر کو کون آ گیا۔" بیگم جمشید اپنی ہنسی روک کر بولیں۔

"میں دیکھتا ہوں امی۔" محمود نے کہا۔

"بیٹا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے معلوم کر لینا کہ کون ہے۔"

"جی اچھا۔" محمود نے کہا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ انسپکٹر جمشید کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

"آپ۔ اس وقت، خیر تو ہے۔" بیگم جمشید گھبرا گئیں۔

"ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ میں ذرا دولت پور جا رہا ہوں۔"

"دولت پور۔ کیوں کیا بات ہے۔۔۔ ساجد تو ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"یوں تو وہ ٹھیک ہی ہے لیکن آج کل بہت پریشان ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بتایا۔

"انکل ساجد کو کیا پریشانی آ پڑی ابا جان۔" محمود بولا۔

"دولت پور میں آج کل اُچکوں نے اودھم مچایا ہوا ہے۔ ہر روز دس بارہ آدمیوں کی جیبیں شارع عام پر کٹ جاتی ہیں اور ساجد آج تک کسی کو پکڑ نہیں سکا۔

مجبور ہو کر اس نے مجھے بلایا ہے۔ آخر میں اس کا دوست ہوں نا۔"

"ہاں۔ آپ کو فوراً جانا چاہیے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"تم میرے کپڑے تیار کر دو۔ میں دو گھنٹے بعد جانے والی گاڑی سے جا رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔" بیگم جمشید نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

تینوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کیے پھر محمود اور فاروق نے فرزانہ کو کوئی اشارہ کیا:

"ابا جان۔ ہم بھی تو آج کل فارغ ہی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں بیٹی۔ پھر تم نے یہ بات کیوں کہی۔"

"ہمیں بھی دولت پور ساتھ لے چلیں۔ سنا ہے، بہت خوبصورت شہر ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"اور تفریحی مقام بھی ہے۔" فاروق بول اٹھا۔

"لیکن میں تو وہاں اچکوں میں الجھا رہوں گا۔ تم لوگوں کو تفریح کیسے کرا سکوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے اعتراض کیا۔

"ہم بھی اچکوں کو پکڑنے میں آپ کی مدد کریں گے۔ اور تفریح کا کیا ہے، وہ تو ہم خود ہی کر لیں گے۔"

"اور یہاں تمہاری امی جو تنہا پریشان ہوں گی۔" انسپکٹر جمشید نے اعتراض کیا۔

"تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں۔"

"تم تینوں تنگ بہت کرتے ہو۔" انسپکٹر جمشید الجھ سے گئے۔

"اگر آپ کا یہی خیال ہے تو ہم نہیں جاتے۔" فاروق نے مسکینی صورت بنا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید ہنس پڑے۔ بولے:

"میں جانتا تھا تم بھی ساتھ چلنے کے لیے ضد کرو گے۔"

"آپ جانتے تھے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ میں تو یہاں تک جانتا ہوں کہ تم تینوں نے پہلے اشاروں ہی اشاروں میں بات کی پھر فرزانہ کو بات شروع کرنے کا اشارہ کیا۔"

"ارے! آپ کو اس کا بھی پتا چل گیا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔ تینوں ہی حیران تھے۔

"ہاں۔ حیران بعد میں ہو لینا پہلے جا کر اپنی امی کو کہو۔ ہم سب چل رہے ہیں۔"

"ابا جان۔" محمود نے اونچی آواز میں کہا۔

"زندہ باد۔" دونوں نے چلا کر کہا اور انسپکٹر جمشید ہنس پڑے۔

بیگم جمشید گھبرا کر باہر نکل آئیں اور بولیں:

"میں نے ابھی ابھی کچھ نعروں کی آوازیں سنی تھیں۔ کیا کوئی جلوس گزر رہا ہے۔"

"جی ابھی گزرا نہیں۔ گزرے گا۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" بیگم جمشید چونکیں۔

"ہم پانچوں کا جلوس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگا۔"

"کیا؟"

"جی ہاں۔ امی۔ ہم سب دولت پور چل رہے ہیں۔"

"ارے! یہ اتنی جلدی پروگرام میں تبدیلی کیسے آگئی۔"

"یہ ان تینوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ سمجھی۔"

"اب سمجھ بعد میں لینا۔ چلنے کی تیاری کرو۔"

"اچھا۔"

☆☆☆

انسپکٹر جمشید کی مہارت

سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں زیادہ رش نہیں تھا۔ بچوں نے کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا پروگرام بنایا تاکہ باہر کے مناظر دیکھ سکیں۔ بیگم جمشید ان کے ساتھ ہی بیٹھیں، البتہ انسپکٹر جمشید ان کے سامنے والی برتھ پر تنہا بیٹھے تھے۔ جونہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی، شریفانہ کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان اندر آیا اور انسپکٹر جمشید کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ادھر ادھر کوئی مناسب جگہ دیکھی تھی۔ لیکن دوسری برتھوں پر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی بیٹھی تھیں اس لیے وہ انسپکٹر جمشید کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ انہوں نے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

"اگر میں سگریٹ پیوں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا......" مسافر نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ شوق سے پی سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔

"شکریہ!" اس نے کہا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے لگا۔

"ارے! شاید میرا لائٹر گھر ہی رہ گیا۔ آپ کے پاس لائٹر یا ماچس ہوگا۔" اس نے پھر انسپکٹر جمشید سے کہا۔

"جی نہیں۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"یہ لیجیے ماچس۔" ایک اور مسافر نے اسے ماچس دیا۔

"شکریہ۔" اس نے سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس واپس کرتے ہوئے کہا۔ پھر انسپکٹر جمشید سے بولا:

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔"

"دولت پور"

"جی۔ کیا کہا۔ دولت پور۔"

"ہاں۔ کیوں، آپ دولت پور کے نام پر چونکے کیوں۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ بھی دولت پور کا نام سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"میں دولت پور کا ہی رہنے والا ہوں اور وہیں جا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ چونکے کیوں تھے۔" انہوں نے پھر پوچھا۔

"ان دنوں لوگ دولت پور جانے سے گھبراتے ہیں۔ کیا آپ سیر کرنے کی غرض سے جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"تو پھر میرا مشورہ ہے کہ نہ ہی جائیں۔"

"کیوں؟"

"آج کل دولت پور اچکوں کا شہر بن کر رہ گیا ہے۔ وہاں اچکوں کا راج ہے۔ کسی کی جیب محفوظ نہیں۔"

"اوہ...... خیر کوئی بات نہیں۔ ہم گھر سے زیادہ پیسے لے کر نکلا ہی نہیں کریں گے۔"

"آپ کی مرضی۔" مسافر نے مایوس ہو کر کہا۔

"دراصل مجھے وہاں ایک کام بھی ہے۔"

"ہوں۔" اس نے صرف اتنا کہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار پر

نظریں جمادیں۔

"ابا جان! ہم دولت پور کتنے بجے پہنچ جائیں گے۔"

"بیٹے یہی کوئی تین بجے......"

"آپ کا دولت پور میں کیا کاروبار ہے۔" اچانک انسپکٹر جمشید نے اس مسافر سے سوال کیا۔

"جی...... جی میں تجارت کرتا ہوں۔"

"بہت خوب...... کس چیز کی تجارت۔"

"ڈبل روٹی کی......"

"کیا نام ہے آپ کا......"

"جی...... مجھے سلطان کہتے ہیں۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ حیران تھے کہ ان کے والد اس مسافر سے اس قسم کے سوال کیوں پوچھ رہے ہیں۔ یہ ان کی عادت کے خلاف تھا۔ جونہی گاڑی دولت پور کے اسٹیشن پر رکنے لگی، وہ مسافر اٹھا اور تیزی سے رینگتی گاڑی سے اتر گیا۔ انسپکٹر جمشید مسکرا کر اترتے دیکھتے رہے پھر بولے:

"بے وقوف!"

"ہم تینوں میں سے کون بے وقوف ہے ابا جان!" فرزانہ نے پوچھا۔

"ابا جان نے تمہیں ہی تو کہا ہے۔" فاروق بول اُٹھا۔

"کیوں...... میں نے کیا کیا ہے۔"

"کیا تو ہم دونوں نے بھی کچھ نہیں۔" محمود نے معصومیت سے کہا۔

"لڑتے کیوں ہو۔ میں نے تم تینوں میں سے کسی کو بے وقوف نہیں کہا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو پھر......؟" ان تینوں نے ایک ساتھ کہا۔ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔ ساتھ ہی تینوں نے ایک ساتھ اپنی امی کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں تو پھر کیا امی جان کو بے وقوف کہا ہے۔ بیگم جمشید نے ان کی نظروں کا مطلب بھانپتے ہوئے کہا۔

"بدتمیز ہو تم...... بھلا یہ مجھے بے وقوف کیوں کہتے۔"

"لیکن امی...... ہم نے تو ایسا نہیں کہا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"بھئی...... دراصل میں نے اُسے بے وقوف کہا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"کسے؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"اس مسافر کو۔ جو میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور جو ابھی ابھی اتر گیا ہے حالانکہ ابھی گاڑی پوری طرح رُکی بھی نہیں ہے۔"

"اوہ۔ اب ہم سمجھے۔ واقعی۔ چلتی گاڑی سے اترنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔" محمود بولا۔

"لیکن میں نے اسے اس وجہ سے بے وقوف نہیں کہا۔"

"تو پھر؟" فرزانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ سمجھتا ہے کہ میرا بٹوہ اُڑا کر لے جا رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا!" تینوں چلائے۔ بیگم جمشید بھی حیران رہ گئیں۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے میرا بٹوہ میری جیب سے نکال لیا تھا۔"

"حیرت ہے۔ بہت ماہر ہیں یہ لوگ۔" بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! اس میں تو کوئی شک نہیں۔"

"تو آپ۔ اُسے پکڑا کیوں نہیں۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"پکڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھئی ہم انہیں کو پکڑنے تو آئے ہیں۔ ان سب کو پکڑنا ہے۔ کسی ایک کو پکڑ کر ہوشیار کرنے سے کیا فائدہ۔"

"تو آپ نے اپنا بٹوہ واپس کیسے حاصل کر لیا۔"

"میں بھی اس فن میں ماہر ہوں۔ جب اس نے میرا بٹوہ نکالا تو مجھے پتا چل گیا۔ لیکن انجان بن کر بیٹھا رہا۔ پھر جب وہ سگریٹ سلگانے لگا تو میں نے اپنا بٹوہ اس صفائی سے نکالا کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی۔ اب وہ اسٹیشن سے باہر جا کر جیب ٹٹولے گا تو ہکا بکا رہ جائے گا۔"

"حیرت ہے۔" محمود بولا۔

"اب تمہیں کس بات پر حیرت ہو رہی ہے۔"

"ابا جان کی مہارت پر۔"

"ارے بھئی کیا گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔" آخر انسپکٹر جمشید نے انہیں یاد دلایا کہ انہیں تو اترنا بھی ہے۔

☆☆☆

خالی پرس

پلیٹ فارم پر انہیں انسپکٹر ساجد کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔

"کیا آپ نے انکل ساجد کو اطلاع نہیں دی تھی۔" محمود نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولے۔

"کیوں؟"

"ہم اس کے ہاں نہیں ٹھہریں گے۔"

"وہ کیوں۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"اگر اس کے ہاں ٹھہرے تو جیب کتروں کو نہیں پکڑ سکیں گے۔"

"تو پھر۔"

"ہم ہوٹل مون لائٹ میں ٹھہریں گے سنا ہے کہ وہ یہاں کا سب سے اچھا ہوٹل ہے۔"

"تو چلیے پھر......" ایک قلی نے ان کا سامان اٹھایا، وہ اسٹیشن سے باہر آنے لگا ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے اور وہ چاروں پچھلی سیٹ پر تھے۔ ٹیکسی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ اچانک ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹا۔ وہ سنبھل نہ سکے۔ ایک طرف کو جھکتے چلے گئے۔ انسپکٹر جمشید بھی چونکہ بے خبر تھے اس لیے ڈرائیور پر لد

پڑے۔ موڑ کاٹنے کے بعد جب ٹیکسی سیدھی دوڑنے لگی تو انسپکٹر جمشید نے محسوس کیا، ان کی جیب ہلکی ہو چکی ہے۔ وہ حیران رہ گئے۔ یہ انسپکٹر جمشید تھے جنھوں نے جیب کے ہلکے پن کو محسوس کر لیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔ انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

"ڈرائیور صاحب۔ ذرا گاڑی روکنا۔"

"شاید ہمیں اسٹیشن واپس جانا پڑے۔ تم گاڑی روک لو۔ میں ایک منٹ کے لیے سوچنا چاہتا ہوں۔ شاید ہم ایک اٹیچی کیس پلیٹ فارم پر ہی بھول آئے ہیں۔"

"اوہ!" ڈرائیور کے منہ سے نکلا اور اس نے ٹیکسی کو بریک لگائے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا کیونکہ وہ گھر سے ایک ہی سوٹ کیس لے کر چلے تھے۔

عین اسی وقت فرزانہ نے اس کے پیر پر پیر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ضرور کوئی بات ہے جس کی وجہ سے ان کے والد ٹیکسی رکوا رہے ہیں۔ اب وہ اتنے بھلکڑ بھی نہیں تھے کہ انہیں یہ بھی یاد نہ رہتا کہ گھر سے کیا کچھ لے کر چلے تھے۔

ٹیکسی رکتے ہی انسپکٹر جمشید نے جیب سے پستول نکال لیا اور ڈرائیور کے سینے پر رکھتے ہوئے بولے۔

"میرا بٹوہ نکالو۔"

"کیا!" ان کے منہ سے حیرت کی زیادتی سے نکلا۔ ڈرائیور بھی ہکا بکا رہ گیا۔ اس سے کوئی بات بن نہ پڑی۔ ساکت و جامد بیٹھا رہ گیا۔

"تم نے پرس نہیں نکالا۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

ڈرائیور نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ان کا بٹوہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے بٹوہ لیا، اپنی جیب میں رکھ کر مسکرا کر بولے:

"ٹیکسی تمہاری اپنی ہے۔"

"ہاں۔" ڈرائیور نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"محمود، ٹیکسی کے نمبر نوٹ کرو۔" انہوں نے محمود سے کہا۔

"جی بہتر۔" محمود نے کہا اور نمبر نوٹ کرنے کے لیے نیچے اتر گیا۔

"لائسنس دکھاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اس نے لائسنس نکال کر ان کو تھما دیا۔

"محمود! اس کا نام بھی نوٹ کرو...... عرفان......"

"جی۔ کر لیا......"

"ٹھیک ہے۔ اب تم مون لائٹ چلو اور یہ بات یاد رکھو کہ یہ پستول میری جیب میں ہوتے ہوئے بھی تمہاری طرف اٹھا رہے گا۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو خود ذمے دار ہو گے۔"

ٹیکسی ایک بار پھر چل پڑی۔ پھر وہ مون لائٹ ہوٹل کے سامنے اترے۔ انسپکٹر جمشید نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور ڈرائیور سے مسکرا کر بولے۔

"اب تم جا سکتے ہو۔"

وہ چند لمحے حیران حیران نگاہوں سے انہیں گھورتا رہا پھر ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ وہ ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے تو ان کی نظریں ایک بورڈ پر پڑیں، اس پر موٹے موٹے سفید حروف میں لکھا تھا:

خبردار! اس ہوٹل میں آنے سے پہلے اپنی جیب ٹٹول لیں۔ اگر کھانا کھانے کے بعد بل ادا نہ کر سکے تو بل آپ کے کوٹ یا رسٹ واچ کی صورت میں وصول کر جائے گا۔ اس شہر میں اچکوں کی حکومت ہے۔ کسی کی جیب محفوظ نہیں۔ جیب کٹ جانے کی صورت میں ہوٹل ذمے دار نہیں ہوگا۔

وہ اس بورڈ کو پڑھ کر حیران بھی ہوئے اور ہنسے بھی۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر انسپکٹر جمشید نے کہا:

"ہمیں ایک ڈبل روم چاہیے۔"

"جی۔ ڈبل روم تو مل جائے گا۔ کیا آپ اپنی جیب کا جائزہ لے چکے ہیں۔" کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میرا بٹوہ محفوظ ہے۔"

"تعجب ہے۔ آپ بٹوہ کیسے بچا لائے۔" کاؤنٹر مین نے حیران ہو کر کہا۔

"بس۔ اسے اتفاق کہہ لیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اس رجسٹر میں اپنا نام۔ پتا درج کر دیں۔ اور تین دن کا ایڈوانس کرایہ ادا کر دیں۔"

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ایک بیرے نے ان کا سامان اٹھایا اور ان کے کمرے تک رہنمائی کی۔ کمرہ بہت خوبصورت اور بہترین قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھے۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ...... جب ضرورت ہوگی، بلا لیں گے۔" انسپکٹر جمشید بیرے سے بولے۔

"اوکے سر!" بیرا چلا گیا۔

"محمود۔ دروازہ اندر سے بند کرلو۔" انہوں نے بیرے کے جاتے ہی کہا۔

"کیوں ابا جان۔ کیا جیب کترے کمرے سے باہر کھڑے کھڑے بھی جیب کاٹ سکتے ہیں۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔" انسپکٹر جمشید ہنسے۔ "دراصل میں تم تینوں کو کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی جیب کترا دروازے کے پاس کھڑا ہو کر سن لے۔"

محمود دروازہ بند کر چکا تو وہ بولے: "تمہارے بٹوؤں میں جتنے پیسے ہیں۔ انہیں نکال کر سوٹ کیس میں رکھ دو۔ بس چند روپے رہنے دو۔ یہ اچکے تو ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہیں۔"

"ابا جان۔ یہ تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔"

"بہت خوب۔ اب تم بٹوؤں کی حفاظت نہ کرنا...... اور بیگم! تمہارے پرس میں تو کوئی نقدی یا زیور وغیرہ نہیں ہے۔"

"نقدی تو نہیں ہے۔ کیونکہ آپ دیتے ہی نہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ "البتہ زیور ضرور ہیں۔"

"کیا غضب کرتی ہو۔ کہاں ہے پرس؟"

"یہ رہا۔ میز پر۔"

"اسے کھول کر دیکھو۔ کیا زیور اس میں موجود ہے۔"

"اگر نہ بھی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیوں۔ فرق کیوں نہیں پڑتا۔"

"اس لیے کہ میں گھر سے نقلی زیور لے کر آئی ہوں۔"

تینوں اپنی امی کی عقل مندی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"بہت خوب۔ ویسے تم دیکھو تو سہی۔ کیا زیور موجود ہے......"

"موجود کیوں نہیں ہوگا۔ پرس تو میرے ہاتھ میں ہی رہا ہے۔"

"اوہو۔ دیکھو تو لو......"

بیگم جمشید نے اٹھ کر پرس کھولا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئیں۔ ان کے منہ سے نکلا "ارے! یہ تو خالی ہے۔"

☆☆☆

شک کی زد میں

اگلی صبح وہ ہوٹل کے ہال میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ بیگم جمشید کے ہاتھ میں ان کا پرس موجود تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی جیبوں میں اپنے اپنے بٹوے تھے۔ انسپکٹر جمشید کی جیب میں بھی پھولا ہوا بٹوہ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے ابھی تک انسپکٹر ساجد کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ اپنے بٹوے میں کچھ زیادہ ہی نوٹ بھر لائے ہیں۔" محمود نے ان کی جیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں چاہتا ہوں کہ کوئی جیب کترا جلدی اس پر ہاتھ ڈال دے۔"

"لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"کیوں فائدہ کیوں نہیں ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کسی کو پکڑتے تو ہیں نہیں۔ گاڑی میں ایک جیب کترے سے ملاقات ہوئی، اسے چھوڑ دیا، پھر ٹیکسی ڈرائیور جیب کترا ثابت ہوا، اسے بھی پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ اب اگر کسی نے پھر آپ کی جیب پر ہاتھ ڈالا تو آپ اسے بھی چھوڑ دیں گے۔" محمود نے کہا۔

"یہی تو بات تم سمجھے نہیں۔"

"کیا بات۔"

"یہی کہ میں جیب کتروں کو پکڑ پکڑ کر چھوڑ کیوں رہا ہوں۔"

"آخر آپ ایسا کس لیے کر رہے ہیں۔" فاروق نے اُلجھ کر پوچھا۔

"سوچو۔ ذہن پر زور دو۔"

تینوں سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر فرزانہ نے سر اٹھایا اور بولی:

"ابا جان میں سمجھ گئی۔"

"لو بھئی فاروق...... فرزانہ کا ذہن تو چل نکلا۔" محمود ہنسا۔

"میں جانتی ہوں۔ تم مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں پاگل کہہ رہے ہو۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"نہیں تو...... محمود نے تو تمہاری تعریف کی ہے۔" فاروق شریر انداز میں بولا۔

"بھئی پہلے سن تو لو۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔" بیگم جمشید نے اسے جھلا کر کہا۔

"اچھا امی جان۔ ہاں تو فرزانہ بتاؤ۔ تم کیا سمجھ گئیں۔"

"آپ جیب کتروں کو پہچان رہے ہیں۔" فرزانہ نے بتایا۔

"کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"مطلب یہ کہ ابا جان یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس شہر میں کون کون جیب کترا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک سمجھیں فرزانہ۔" انسپکٹر جمشید نے تعریف کی۔

"شکریہ ابا جان......"

"اچھا، اب یہ بتاؤ، تم تینوں کے بٹوؤں کی کیا کیفیت ہے۔"

"ابا جان۔ ان تینوں میں جیب کتروں کے لیے تین پیغام ہیں......"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔ کیونکہ انہیں ان تینوں کے اس پروگرام

کا کوئی علم نہیں تھا۔

"ہم نے رات ایک ایک سادہ کاغذ پر جیب کتروں کے نام پیغام لکھ کر اپنے اپنے بٹوے میں رکھ لیے ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جیب کترے آئیں اور تینوں بٹوؤں کو اڑا لے جائیں۔"

"اور بیگم۔ کیا تم بھی اپنے پرس میں کچھ رکھ کر لائی ہو۔"

"مجھے تو پہلے ہی اپنے زیور کے گم ہونے کا افسوس ہے۔" بیگم جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیوں کیوں۔ وہ تو نقلی تھا۔"

"ہاں۔ تھا تو نقلی ہی لیکن پورے پندرہ روپے کا تھا۔"

"صرف!" انسپکٹر جمشید ہنسے۔

"معلوم ہوتا ہے۔ آج جیب کترے سو گئے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"آخر وہ بھی انسان ہیں۔ انہیں بھی نیند آتی ہوگی۔" فرزانہ نے اس کا مذاق اڑایا۔

"ہاں۔ رات کو تو انہیں سونا نصیب ہوتا نہیں۔" فاروق نے جواب میں کہا۔

اچانک ہوٹل کے ہال میں بیرونی دروازے سے ایک بلی اندر داخل ہوئی۔ فوراً بعد ہی ایک سیاہ رنگ کا خوفناک کتا بھی اس کے پیچھے جھپٹتا ہوا داخل ہوا۔ بس پھر کیا تھا۔ سارے ہال میں کھلبلی مچ گئی۔ بلی آگے آگے تھی اور کتا پیچھے پیچھے۔ سارے ہال میں چکراتے پھر رہے تھے۔ اور لوگ ان سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید، بیگم جمشید اور تینوں بچے بھی ہڑبونگ کی زد سے بچ نہ سکے۔ اس دوران میں ان سے کئی آدمی ٹکرائے۔

آخر ہوٹل کے دو تین بیرے کہیں سے ڈنڈے لے آئے اور انہوں نے مار مار کر دونوں کو ہوٹل سے باہر نکال دیا۔

ہوٹل کے ہال میں ماحول پُرسکون ہونے میں پندرہ منٹ لگے۔ لیکن یہ سکون چند منٹ بھی برقرار نہ رہ سکا۔ کئی لوگ بول اُٹھے۔

"ارے! میرا بٹوہ!" "ارے! میں لٹ گیا....." "میری جیب کٹ گئی۔"

انہوں نے چونک کر اپنی اپنی جیب کی طرف دیکھا تینوں بچوں کے منہ سے حیرت کے باعث کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"ابا جان۔ ہم تینوں کے بٹوے غائب ہیں۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو کیا۔ آپ کا بٹوہ بھی۔" فاروق کہتے کہتے رک گیا۔

"نہیں۔ وہ محفوظ ہے۔ دراصل بلی اور کتے کے اندر داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اب لوگوں کے بٹوؤں کی خیر نہیں۔ اس لیے میں نے اپنے بٹوے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔"

"تو کیا آپ کی جیب پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈالا کیوں نہیں۔ لیکن اس کا ہاتھ میری جیب کی بجائے میرے ہاتھ سے ٹکرا گیا تھا۔ یہ دیکھو۔"

انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ ان کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

"ارے! یہ کیا ہوا۔" بیگم جمشید اور تینوں بچے گھبرا گئے۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ شاید جیب کترے کا بلیڈ لگ گیا ہے۔" انہوں نے کہا اور ہاتھ پر رومال باندھنے لگے۔

اسی وقت ایک کانسٹیبل کی آواز آئی:

"خبردار۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہوٹل کا دروازہ بند کر دو۔" انہوں نے دیکھا کہ پانچ کانسٹیبل ہوٹل کے ہال میں داخل ہو رہے تھے، ان میں ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔

"بہت خوب! انسپکٹر ساجد کا عمل خاصا تیز ہے۔" انسپکٹر جمشید نے تعریف کی۔

"کیا ان کے خیال میں جیب کترے ہال ہی میں بیٹھے ہوئے ہوں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ان کا خیال تو یہی ہوگا۔ اسی لیے ہوٹل کا دروازہ بند کروا دیا ہے۔ ویسے جیب کترے تو کہیں کے کہیں پہنچ چکے ہیں۔"

انہوں نے دیکھا کہ سب انسپکٹر کاؤنٹر کے پاس پڑے ہوئے اسٹول پر چڑھ رہا تھا۔

"کیا اس کا ارادہ تقریر کرنے کا ہے۔" محمود ہنسا۔

"نہیں۔ وہ ہوٹل میں موجود تمام لوگوں کی تلاشی لینے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

"اوہ! تو کیا ہماری بھی تلاشی لی جائے گی۔" فاروق بولا۔

"ہاں! سب کی۔" انسپکٹر جمشید بولے اسی وقت سب انسپکٹر کی آواز ہال میں گونجی:

"حاضرین! میں معافی چاہتا ہوں کہ ہوٹل کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے آپ لوگ یہاں سے جا نہیں سکیں گے۔ دراصل ہم سب کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"کیا!" بے شمار لوگ چلا اٹھے۔

"جی ہاں۔ آپ میں سے کوئی اپنی میز سے نہ اُٹھے۔"

"لیکن ہم تلاشی کیوں دیں۔ کیا ہم جیب کترے ہیں۔" کوئی صاحب چلائے۔

"آپ جیب کترے نہیں ہیں۔ لیکن کیا آپ نہیں چاہتے کہ جیب کترے پکڑے جائیں۔"

"چاہتے ہیں۔ چاہتے کیوں نہیں۔" وہ لوگ چلا اٹھے جن کی ابھی ابھی جیبیں کٹی تھیں۔

"تب پھر آپ سب کو تلاشی دینی ہوگی۔" انسپکٹر نے با آواز بلند کہا۔

اس مرتبہ کوئی کچھ نہ بولا۔ اور کانسٹیبل تلاشی لینے لگے۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔" سب انسپکٹر نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ وہ ٹھہر گئے۔

"جن لوگوں کی جیبیں کٹی ہیں، وہ کاؤنٹر پر آجائیں۔"

"ابا جان۔ کیا ہم تینوں بھی جائیں۔" محمود نے پوچھا۔

"نہیں۔ تمہارے بٹوں میں تھا ہی کیا۔ تم بیٹھے رہو۔"

"جی اچھا۔"

چھ سات آدمی اٹھے اور کاؤنٹر پر چلے گئے۔

"اب تم تلاشی لو۔ اور ہر بٹوہ ان کو دکھاتے رہو۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"آدمی ذہین ہے۔" انسپکٹر جمشید نے سب انسپکٹر کی تعریف کی۔

"کیا آپ بھی تلاشی دیں گے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔" وہ بولے۔

ہال کے تمام آدمیوں کی تلاشی لینے میں آدھ گھنٹا صرف ہوا۔ لیکن ان لٹنے والوں میں سے کسی نے بھی کسی کے بٹوے کو اپنا بٹوہ نہیں بتایا۔ انسپکٹر جمشید اور ان کے بچوں کی بھی باری آئی۔

کانسٹیبل نے چونک کر انسپکٹر جمشید کا بٹوہ دیکھا اور سب انسپکٹر کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ سیدھا اس کی طرف آیا۔

"ہاں! کیا بات ہے۔" اس نے سرگوشی میں پوچھا لیکن آواز ان تک پہنچ گئی کیونکہ ہال میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

"ان صاحب کا بٹوہ بہت پھولا ہوا ہے۔ کہیں انہوں نے لوگوں کے بٹوے خالی کر کے ادھر ادھر نہ پھینک دیے ہوں اور نوٹ اپنے بٹوے میں بھر لیے ہوں۔"

"گڈ! تم نے اچھا خیال ظاہر کیا۔ اچھا میں دیکھ لیتا ہوں۔" سب انسپکٹر نے

کہا اور انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا:

"ذرا اپنا بٹوہ دکھایئے۔" اس نے شریفانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ آپ کا آدمی دیکھ تو چکا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"ذرا میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن۔ آپ نے اور تو کسی کا بٹوہ نہیں دیکھا۔"

"دیکھیے۔ مجھ سے بحث نہ کریں۔ بٹوہ مجھے دکھا دیں۔" سب انسپکٹر کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"اچھا جناب...... لیجیے۔" آخر انسپکٹر جمشید نے معاملے کو رفع دفع کی غرض سے کہا اور بٹوہ اسے دے دیا۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا:

"اتنے نوٹ۔ اس شہر میں تو کوئی بٹوے میں سو روپے بھی لے کر نہیں نکلتا۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا یہ جرم ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بھی تیز لہجے میں کہا۔ ان کی آواز پر کئی آس پاس کے لوگ ادھر متوجہ ہو گئے اور ان کی آپس کی گفتگو سننے لگے۔

"یہ جرم تو نہیں ہے۔ لیکن شک کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے بٹوے آپ نے اڑائے اور نوٹ ان میں سے نکال کر اس میں بھر لیے۔ تاکہ پکڑے نہ جا سکیں۔"

"خیال تو اچھا ہے۔ مگر۔ خالی بٹوے کہاں گئے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ ادھر ادھر پھینک دیے ہوں گے......" سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

"بہت خوب! تو پہلے خالی بٹوے برآمد کر لو۔"

"ہو سکتا ہے۔ خالی بٹوے تمہارا کوئی آدمی لے کر باہر گیا ہو۔"

"میں کیوں باہر نہیں نکل گیا۔" انسپکٹر جمشید نے جواب میں کہا۔

"بہر حال...... میں آپ کو شک کی بنا پر گرفتار کر رہا ہوں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ اور وہ اس کی بات سن کر چونک اٹھے۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی۔ وہ اس شہر کے جیب کتروں کو گرفتار کرنے کی مہم پر آئے تھے اور یہاں الٹا انہیں ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" وہ پرسکون آواز میں بولے۔

"کیوں؟" سب انسپکٹر نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ اس واقعے کو ابھی ایک منٹ بھی نہیں ہوا۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہے۔ بہت کچھ ہوتا ہے۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" سب انسپکٹر نے جھنجھلا کر کہا۔

"میرے بٹوے میں اس وقت جتنے نوٹ ہیں۔ تم انہیں ایک منٹ میں گن سکتے ہو۔" وہ مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران رہ گیا۔

"جب کہ میں بتا سکتا ہوں۔ میری جیب میں کتنے کے نوٹ ہیں۔"

سب انسپکٹر یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اس نے سوچا۔ سامنے بیٹھا ہوا شخص کوئی بے وقوف نہیں ہے۔ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آخر وہ سوچ کر بولا:

"اچھا بتاؤ۔ تمہارے پرس میں کتنے روپے ہیں۔"

"تیس ہزار نو سو پندرہ روپے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ رقم ایک منٹ میں گنی جا سکتی ہے۔" سب انسپکٹر بولا۔

"شاید تم ایک منٹ میں گن لو۔ لیکن گننے کے بعد فوراً ہی نہیں بتا سکتے کہ کون کون سے نوٹ کتنے کتنے ہیں۔ جب کہ میں بتا سکتا ہوں۔"

"اچھا بتایئے۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

انسپکٹر جمشید بتانے لگے۔ وہ نوٹ گن گن کر تصدیق کرتا رہا۔

آخر میں اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انسپکٹر جمشید نے ایک ایک بات صحیح بتائی تھی۔

"کیا آپ اسی شہر میں رہتے ہیں۔"

"نہیں۔"

"کہاں سے آئے ہیں۔"

"اوپر سے۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

"کیا مطلب۔ کیا آسمان سے آئے ہیں؟" سب انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں اس ہوٹل کی دوسری منزل پر ٹھہرا ہوا ہوں اس لیے کہا ہے کہ اوپر سے آیا ہوں۔" وہ مسکرائے۔ کئی لوگ ان کی بات پر ہنس پڑے۔

"آپ کے کمرے کا نمبر کیا ہے۔"

"ایک سو گیارہ۔"

"بہت اچھا۔ آپ ہوٹل چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ جب تک کہ آپ کو ہماری طرف سے اجازت نہ ملے۔"

"وہ کیوں۔"

"اس لیے کہ آپ اب بھی شک کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ ہمارے انسپکٹر صاحب آپ سے کچھ پوچھ گچھ کرنا پسند کریں گے۔"

انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے۔ اس کے بعد کانسٹیبلوں نے پورے ہوٹل کی تلاشی بھی لی مگر انہیں کہیں سے کوئی خالی بٹوہ نہیں ملا۔

☆☆☆

حیرت ہے

انسپکٹر ساجد سخت پریشان تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے دفتر میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اب تک انسپکٹر جمشید کیوں نہیں آئے۔ شہر کی حالت وہی تھی۔ لوگوں کی جیبوں پر جیبیں کٹ رہی تھیں اور اس کا ناک میں دم آیا ہوا تھا۔

ابھی ابھی اسے ایک اور حیرت انگیز اطلاع ملی تھی۔ ایک کانسٹیبل نے بتایا تھا کہ مون لائٹ ہوٹل میں پہلے ایک بلی گھسی اور اس کے پیچھے ایک کتا۔ پھر ہوٹل میں ہڑبونگ مچ گئی اور اس ہڑبونگ میں چھ سات لوگوں کی جیب کٹ گئیں۔ وہ جیب کتروں کی دیدہ دلیری پر حیرت زدہ رہ گیا اور مون لائٹ ہوٹل جانے کے لیے اٹھا ہی تھا اس کا ماتحت سب انسپکٹر اندر داخل ہوا۔

"کہاں چلے سر!"

"مون لائٹ ہوٹل۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہاں بھرے پُرے ہال میں چھ سات آدمیوں کی جیبیں کاٹ لی گئی ہیں۔" انسپکٹر ساجد نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"جانتا ہوں سر!"

"تو پھر تم سیدھے وہاں کیوں نہیں پہنچے۔ یہاں کیا لینے آئے ہو۔"

"سر! میں اس وقت ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا جب یہ واقعہ پیش

آیا۔"

"اوہ پھر؟"

"پھر یہ کہ پانچ کانسٹیبلوں کو لے کر ہوٹل میں گھس گیا۔ اس کا بیرونی دروازہ بند کروادیا اور ہال میں موجود تمام لوگوں کی تلاشی لی۔"

"تو کیا کوئی جیب کترا پکڑا گیا۔" انسپکٹر ساجد خوش ہو کر بولا۔

"یہی تو افسوس ہے کہ نہیں پکڑا جا سکا البتہ ...... ہال میں ایک شخص کی جیب سے بہت پھولا ہوا بٹوہ نکلا تھا۔ اس کے بٹوے میں ساڑھے تیس ہزار روپے کی رقم تھی۔ مجھے اس پر شک ہے۔"

"تو تم اسے پکڑ کر کیوں نہیں لائے۔"

"میں چاہتا تو یہی تھا۔ مگر وہ شخص، بہت چالاک ثابت ہوا۔"

"تو کیا وہ فرار ہو گیا۔"

"جی نہیں۔ بلکہ وہ تو اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے، میں اسے پابند کر آیا ہوں اور ہوٹل کے منیجر سے بھی کہہ آیا ہوں کہ اگر وہ ہوٹل چھوڑ کر جانے لگے تو فوراً ہمیں اطلاع دے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چل کر اسے دیکھتا ہوں، وہ کتنا چالاک ہے۔"

"چلیے۔"

دونوں اٹھ کر باہر آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ اچانک سب انسپکٹر کا رنگ اڑ گیا۔

"ایک منٹ ٹھہریے سر!" وہ جیپ سے اترتا ہوا بولا۔

"کیا بات ہے۔" انسپکٹر ساجد نے اسے بری طرح گھورا۔

لیکن وہ تو یہ کہتا ہوا دوبارہ کمرے میں گھس گیا تھا:

"ابھی آیا سر!"

پھر وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"آخر تمہیں ہوا کیا ہے۔ اتنے گھبرا کیوں گئے ایک دم۔" انسپکٹر بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اب یہ ثابت ہو جاتی ہے۔" سب انسپکٹر بڑبڑایا۔ جیپ میں بیٹھ کر اسٹیئرنگ سنبھال چکا تھا۔

"کون سی بات ثابت ہو جاتی ہے۔" انسپکٹر ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ ضرور جیب کتروں کا سردار ہے۔"

"کون۔ وہ۔"

"وہی۔ جس سے آپ ملنے جا رہے ہیں۔"

"یہ یکایک۔ تم اس نتیجے پر کیسے پہنچ گئے۔ ابھی ابھی تو تمہیں اس پر صرف شک تھا۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سر ---- م ---- میرا ----"

"کیا بات ہے بھئی۔" انسپکٹر ساجد حیران تھا۔

"وہ ---- وہ ---- میرا بٹوہ۔" سب انسپکٹر نے اپنی جیب الٹ کر دکھادی جو خالی تھی۔

"کیا!" انسپکٹر ساجد چلایا۔

☆☆

انسپکٹر جمشید اپنے کمرے میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے آج کی حیرت انگیز واردات کے متعلق باتیں کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے۔

"جیب کترے واقعی بہت دیدہ دلیر ہیں۔"

"کیا آپ بھی نہیں دیکھ سکے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"کیا نہیں دیکھ سکا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"جب لوگوں کی جیبیں کاٹی گئیں، اس وقت آپ نے کسی کو کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"نہیں۔ میرے لیے بھی یہ اتنا ہی اچانک پیش آیا جتنا دوسروں کے لیے۔ دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھرے پرے ہال میں اس دیدہ دلیری سے واردات کر جائیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"اور اب سب انسپکٹر صاحب اپنے انسپکٹر کو لے کر یہاں آئیں گے۔" فاروق نے لطف لے کر کہا۔

"ہاں! سب انسپکٹر کو تو ویسے بھی آنا پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیوں۔ یہ کس لیے کہہ رہے ہیں آپ۔" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اسے ابا جان پر شک ہو گیا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"میں اتنا تو سمجھتا ہوں۔ لیکن ابا جان کے لہجے میں کوئی اور جھلک بھی تھی۔" محمود بولا۔

"اب تمہیں لہجوں میں بھی جھلک نظر آنے لگی۔" فاروق نے اس کا مذاق اڑایا۔

"تو تمہیں کس چیز میں جھلک نظر آتی ہے۔" محمود نے جل کر کہا۔

"تم میں جھلک نظر آتی ہے۔ بتاؤں کس قسم کی۔" فاروق مسکرایا۔

"جی فرمایئے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔" محمود نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"غصے کی....." فاروق بولا اور فرزانہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"کھی کھی کرتی ہوئی تم بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" محمود اس کی طرف جھلا کر مڑا۔

"تو کیا ریں ریں کرتی ہوئی اچھی لگتی ہوں۔" فرزانہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم تو لڑنے لگے۔ بات ہو رہی تھی سب انسپکٹر کی۔" آخر انسپکٹر جمشید نے دخل دیا۔

"جی ہاں۔ یہ دونوں تو یونہی بات کو کہیں سے کہیں گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔" محمود بول اٹھا۔

"لو۔ اب باتیں بھی گھسیٹی جانے لگیں۔" فرزانہ نے کھی کھی پھر شروع ہو گئی۔

"فرزانہ۔ بُری بات ہے۔ محمود تمہارا بڑا بھائی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے ڈانٹا۔

"اوہ۔ اہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

"چلو شکر ہے۔ تمہیں یاد تو آیا۔" محمود ابھی تک غصے میں تھا۔

"اور فرزانہ۔ کہیں تم یہ بھی تو نہیں بھول گئیں کہ میں بھی تمہارا بڑا بھائی ہوں۔" فاروق ہنسا۔

"جی بھائی جان۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔"

"توبہ! ان تینوں کی زبانیں تو جلے گھڑنے کی مشینیں ہیں۔" بیگم جمشید بولیں۔

"شکریہ امی جان۔" تینوں ایک ساتھ بولے۔ انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید اپنی ہنسی کسی طرح نہ روک سکے۔

"ابا جان۔ آپ کہہ رہے تھے کہ سب انسپکٹر تو ویسے بھی آئے گا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اپنی جیب کٹ گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"محمود۔ دیکھو کون ہے۔"

"جی۔ اچھا۔" محمود نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو بیرا نظر آیا۔

"کیا بات ہے۔" محمود نے چونک کر پوچھا کیونکہ بیرے تو صرف بلانے پر ہی آتے ہیں۔

"دو پولیس آفیسر آپ کے والد کو نیچے بلا رہے ہیں۔" بیرے نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے اس کے الفاظ سن لیے تھے لہٰذا وہ خود ہی بولے۔

"تم انہیں اوپر ہی لے آؤ۔"

"جی!" بیرا حیران رہ گیا۔

"ہاں بھئی۔ کہہ دو۔ اوپر ہی تشریف لے آئیں۔"

"جی اچھا۔"

بیرے نے کہا اور سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا۔ اب سب انسپکٹر کا پارہ اور چڑھ جائے گا۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب۔؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"یہ دیکھو۔ یہ کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے جیب سے کوئی چیز نکالتے ہوئے

کہا۔

"ارے۔ یہ بٹوہ آپ کا تو نہیں۔" محمود نے ان کے ہاتھ میں بٹوہ دیکھ کر کہا۔

"ہاں! یہ اس سب انسپکٹر کا ہے۔"

"کیا! وہ حیران رہ گئے۔"

"یہ آپ کے پاس کیسے آ گیا۔"

یہی وجہ تھی کہ میں نے کہا تھا سب انسپکٹر کو تو ویسے بھی آنا پڑے گا۔"

"آخر یہ آپ کو کیسے مل گیا۔"

"میں نے اس کی جیب سے نکالا ہے۔"

"جی!"

ان کی "جی" لمبی ہوتی چلی ہوگئی۔ اس وقت دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔

☆☆☆

تین پُرزے

"ابا جان! وہ آ گئے۔ آپ پرس کو چھپا لیں۔" محمود جلدی سے بولا۔

"کیوں۔ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ جا کر دروازہ کھول دو۔" انسپکٹر جمشید نے پرس کو میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔" وہ مسکرائے۔ محمود نے دروازے کے پاس جا کر چٹخنی گرا دی۔ جونہی وہ دروازہ کھول کر مڑا انسپکٹر جمشید غائب تھے۔

"ارے!" اس کے منہ سے نکلا۔ اسی وقت دونوں آفیسر اندر داخل ہوئے۔

"سر! وہ رہا میرا بٹوہ۔ دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا یہیں یہ پکڑا گیا۔" سب انسپکٹر چلایا۔

"یہ تمہارا پرس ہے۔" ساجد نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"ٹھیک ہے۔ بچو تمہارے والد کہاں ہیں۔"

"ہم انہیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔" ساجد نے کہا۔

"وہ غسل خانے میں ہیں۔"

"اوہ۔ اچھا۔" دونوں بیٹھ گئے۔

انسپکٹر ساجد کبھی ان سے نہیں ملا تھا اس لیے جان نہ سکا۔ اسی وقت غسل خانے کا دروازہ کھلا اور انسپکٹر جمشید ہاتھ میں تولیہ لیے باہر نکلے:

"کیا آپ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

دونوں چونک کر مڑے۔

"جی ہاں۔ ثبوت یہ موجود ہے۔ میرا پرس جو تم نے میری جیب سے نکالا ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا اور پھر اپنے افسر کی طرف دیکھا مگر وہ تو حیرت کی وجہ سے بت بنا کھڑا تھا۔

"تو میں کب کہتا ہوں کہ میں نے پرس نہیں نکالا۔"

"مجرم اپنے جرم کا اقرار کر رہا ہے سر!" سب انسپکٹر نے کہا۔

"ہوں۔ تم کب آئے اور یہ آنے کا کون سا طریقہ ہے۔" ساجد نے انہیں گھور کر کہا۔

"کل کا آیا ہوا ہوں۔ نہ صرف میں۔ بلکہ یہ لوگ بھی۔" انسپکٹر جمشید نے بیوی بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو یہ بھابی ہیں۔ اور یہ محمود، فاروق اور فرزانہ۔"

"ہاں!"

"کمال ہے۔ تمہیں یہاں آ کر ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"سیدھا تمہارے پاس جاتا تو جیب کتروں کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ بچو تم نے اپنے انکل کو سلام نہیں کیا۔" وہ ساجد سے کہتے کہتے ان تینوں کی طرف مڑے۔

"انکل السلام علیکم۔" تینوں ایک ساتھ بولے۔

ساجد نے مسکرا کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ انہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ سب کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔

"بیٹھو طاہر۔ ان سے ملو۔ یہ ہیں انسپکٹر جمشید۔ میرے دیرینہ دوست۔"

"جی!" طاہر حیران رہ گیا۔

"ہاں۔ یہ ہماری مدد کرنے آئے ہیں۔ جیب کتروں کو پکڑنے کے سلسلے میں۔"

"اور آپ الٹا مجھے ہی گرفتار کر رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن آپ نے میرا بٹوہ کیوں نکالا۔" طاہر نے پوچھا۔

"تاکہ تم ساجد کو یہاں لے آؤ۔"

"حیرت ہے۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب آپ نے بٹوہ نکال لیا۔"

"تو ہمارے شہر آتے ہی تمہارے سامنے ایک واردات بھی ہو گئی۔" ساجد بولا۔

"ایک نہیں۔ تین۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تین۔ کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا۔"

"پہلی واردات میرے ساتھ ٹرین میں ہوئی۔ آپ کے شہر کے ایک مہربان نے میرا بٹوہ اڑا لیا۔"

"ارے!" ساجد اور طاہر ایک ساتھ بولے۔

"پھر ٹیکسی ڈرائیور نے بھی یہی کیا۔"

"اوہ!"

"ان دونوں سے تو میں نے بٹوے حاصل کر لیے۔ تیسری مرتبہ اس نے اپنا بٹوہ چوری ہی نہیں ہونے دیا۔ البتہ محمود، فاروق اور فرزانہ کے بٹوے جیب کترے لے گئے۔ اور ہاں۔ تمہاری بھابھی کے پرس میں سے ایک نقلی زیور بھی۔"

"کیا۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔"

"اب یہ تینوں تمہیں بتائیں گے کہ ان کے بٹوؤں میں کیا کیا تھا۔ چاہو تو باقاعدہ رپورٹ بھی لکھ سکتے ہو۔"

"لیکن۔ تم نے ان دونوں کا کیا کیا۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کرتا کیا۔ ان کو جانے دیا۔"

"وہ کس خوشی میں۔"

"دوبارہ پکڑنے کی خوشی میں۔ میں ان کو اکٹھے ہی پکڑوں گا۔"

"اکٹھے۔ کیا مطلب؟"

"یہاں کوئی باقاعدہ گروہ یہ حرکتیں کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رات کو کہیں اکٹھے ضرور ہوتے ہیں۔ گروہ کے سردار کو اپنی اپنی دن بھر کی کمائی دینے کے لیے۔"

"کمال ہے۔ تم آتے ہی اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے۔"

"تم نے ان تینوں سے تو پوچھا ہی نہیں کہ ان کے بٹوؤں میں کیا کیا تھا۔"

"اوہ۔ ہاں۔ یہ تو میں بھول گیا۔ طاہر میاں تم جا سکتے ہو۔ آنکھیں کھلی رکھو۔"

"اچھا۔" طاہر کمرے سے نکل گیا۔

"ہاں! اب بتاؤ۔ تمہارے بٹوؤں میں کیا تھا؟"

☆☆

رات کے نو بج رہے تھے۔

دولت پور کی ایک عمارت کے بڑے سے کمرے میں اس وقت کوئی دس کے قریب اُچکے جمع تھے۔ ان سب کے چہرے غیر شریفانہ تھے۔ کمرے میں ان کے باتیں کرنے سے ایسی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ اچانک ہال میں خاموشی چھا گئی۔ ایک دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ وہ سب اُٹھ گئے۔ کئی ایک کے منہ سے نکلا۔ "استاد!"

وہ کمرے کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک اونچی جگہ پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم سب نے اپنے اپنے بٹوؤں کو کھول کر نہیں دیکھا ہوگا۔ کیونکہ ہمارا اصول ہے۔ جو مال جس حالت میں ملے، اسے اسی صورت میں یہاں لے آؤ۔ اگر تم میں سے کسی نے کوئی بٹوہ کھول کر دیکھنے کی جرأت کی ہے تو وہ کھڑا ہو کر خود ہی بتا دے۔ اس وقت میں اسے کچھ نہیں کہوں گا...... لیکن اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ کسی نے ایسی حرکت کی تھی تو پھر اس کی خیر نہیں"

سب نے خاموشی سے اس کی بات کو سنا...... لیکن کوئی بھی کھڑا نہیں ہوا......

"ٹھیک ہے، اب باری باری اپنے بٹوے کھول کر اس کا اعلان کرو۔" استاد نے اطمینان سے کہا۔

ان میں سے ایک اٹھا۔ اور کہنے لگا:

"استاد! آج میں نے تین آدمیوں کے بٹوے اڑائے ہیں۔"

اس نے بٹوے دکھاتے ہوئے کہا پھر وہ ایک بٹوہ کھول کر دیکھنے لگا۔

"ان میں سے ایک میں ایک ہزار دس روپے، دوسرے میں پانچ سو تیس روپے، تیسرے میں صرف انیس روپے ہیں۔"

"ایک ہزار دس والا ہماری طرف اچھال دو۔ باقی دو تمہارے!" استاد نے حکم دیا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور پرس استاد کی طرف اچھال دیا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اس کے بعد دوسرا آدمی کھڑا ہوا۔

"میرے ہاتھ صرف ایک بٹوہ لگا، اس میں ڈیڑھ ہزار روپے ہیں......" اس نے بتایا۔

"پچاس سو روپے رکھ کر بٹوہ میری طرف اچھال دو۔"

حکم کی تعمیل کی گئی پھر تیسرا شخص کھڑا ہوا:

"میرے ہاتھ صرف ایک بٹوہ لگا...... ارے! یہ تو خالی ہے۔" سب ہنسنے لگے۔

"نہیں خالی نہیں ہے۔ اس میں تو ایک سفید کاغذ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بٹوے میں سے کاغذ نکالا اور اسے بلند آواز میں پڑھا:

"بڑے آئے اچکے کہیں کے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" استاد غرایا۔

"خدا جانے استاد۔"

"کاغذ مجھے دکھاؤ۔" استاد نے غصیلے لہجے میں کہا۔

اچکا استاد کے پاس گیا اور کاغذ اس کو دے دیا۔ اس نے کاغذ پر لکھا جملہ پڑھا اور حیران ہو کر پوچھا:

"یہ بٹوہ تم نے کہاں سے اڑایا تھا۔"

"مون لائٹ ہوٹل کی میز پر ایک نوعمر لڑکے کی جیب سے۔"

"ہوں۔" وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

"استاد۔ میں نے اسی میز کے دوسرے لڑکے کی جیب سے پرس اڑایا تھا۔"

"تو نکالو تم بھی۔ اور دیکھو اس میں کیا ہے۔"

اس نے جیب سے بٹوہ نکالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ وہ بٹوے میں سے ایک کاغذ نکال رہا تھا پھر اس نے کاغذ پر لکھا ہوا جملہ پڑھا۔

"اچکوں کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔"

"یہ سب کیا ہے۔"

"اور استاد۔ میں نے بھی اسی میز پر بیٹھی ایک لڑکی کا پرس اڑایا تھا۔"

"کیا!" استاد تقریباً چلایا۔ "نکالو تم بھی۔ اور پڑھو اس میں کیا لکھا ہے۔"

تیسرا اچکا پرس میں کاغذ نکالنے لگا۔

☆☆☆

گاڑی والا

"اور اب بیٹی! تم بتاؤ۔ تم نے اپنے پرزے پر اچکوں کو کیا پیغام دیا ہے۔"
محمود اور فاروق اپنے اپنے جملے بتا چکے تو ساجد نے ہنس کر فرزانہ سے پوچھا۔

"انکل میں نے اپنے پرزے پر لکھا تھا۔۔۔ دولت پور کے تمام اچکوں کو چاہیے کہ وہ دولت پور کی تمام دولت سمیٹنے کا خیال دل سے نکال دیں۔"

"بہت خوب۔ اچکے بھی خوب چکرا رہے ہوں گے یہ پرزے پڑھ پڑھ کر۔" ساجد ہنسا۔

"مگر حیرت ہے۔ انہوں نے بچوں کے بٹوے بھی نہ چھوڑے۔" انسپکٹر ساجد بولا۔

"معلوم ہوتا ہے ان کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھا۔ اب تمہارا پروگرام کیا ہے؟" ساجد نے پوچھا۔

"محمود۔ تم نے ٹیکسی کے نمبر نوٹ کیے تھے۔"

"جی ہاں۔ یہ رہے۔" محمود نے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

"یہاں ٹیکسیوں کے کتنے اڈے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"صرف ایک۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تم اس ٹیکسی ڈرائیور کے گھر کا پتا وہاں سے معلوم کر کے اس

کی نگرانی کراؤ۔"

"یہاں جتنی بھی ٹیکسیاں چلتی ہیں، وہ ایک ہی آدمی کی ملکیت ہیں۔ وہی مالک ہے۔ اس سے اس ڈرائیور کے گھر کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔" ساجد نے بتایا۔

"ابھی شام کے پانچ ہی بجے ہیں، وہ اڈے میں موجود ہوگا۔"

"بس تو پھر پہلے یہی بات معلوم کرنی چاہیے۔"

"ابا جان۔ کیوں نہ ہم بھی چلیں۔ شہر کی تھوڑی سی سیر ہی ہو جائے گی۔"

"چلو یونہی سہی۔ بیگم تمہارا کیا خیال ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر پوچھا۔

"میں تو بہت تھکن محسوس کر رہی ہوں۔ آرام کروں گی۔ آپ لوگ جائیں۔"
وہ ہوٹل سے باہر نکل کر جیپ میں بیٹھے اور ٹیکسیوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ پندرہ منٹ بعد وہ وہاں پہنچ گئے۔

"کیا خیال ہے۔ مالک کو یہیں بلا لیا جائے۔" ساجد نے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"اچھا! میں لاتا ہوں۔" ساجد نیچے اترا اور اڈے کے اندر بنے ایک کمرے کی طرف چلا گیا۔ جلد ہی ایک لمبے چوڑے آدمی کے ساتھ واپس آ گیا۔

"فیروز۔ تمہاری ٹیکسی نمبر ۲۹۳۳ آج کل کون چلا رہا ہے۔" ساجد نے پوچھا۔

"کیوں۔ انسپکٹر صاحب کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔"

"اس سے کچھ کام ہے ہمیں۔"

"اس کا نام بابر ہے۔"

"کہاں رہتا ہے۔"

"احسان روڈ پر مکان نمبر ۱۱۹۔"

"بہت بہت شکریہ۔" ساجد نے کہا۔

"آپ نے بتایا نہیں اس سے کیا کام آپڑا ہے۔"

"کوئی خاص کام نہیں ہے۔" ساجد نے کہا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔

"اب کیا کیا جائے۔" ساجد نے کچھ دور آ کر پوچھا۔

"اس کے مکان کی نگرانی کراؤ۔ صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ رات کے وقت وہ اپنے گھر سے کہیں جاتا تو نہیں۔ اور جاتا ہے تو کہاں۔"

"بہت اچھا۔ میں طاہر کی ڈیوٹی وہاں لگا دیتا ہوں۔"

"اب کہاں چلیں۔"

"ہمیں ہوٹل میں چھوڑ کر تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔"

"تو تم لوگ میرے ہاں نہیں چلو گے۔"

"نہیں۔"

"آخر اس ہوٹل میں رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"دیکھو ساجد۔ تم جیب کتروں کو پکڑنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

"بالکل چاہتا ہوں۔ آج کل تو اس سے بڑی کوئی خواہش ہی نہیں ہے۔"

"تو بس پھر...... ہمیں یہیں رہنے دو۔ اچکوں کی گرفتاری کے بعد البتہ تمہارے ہاں دو چار دن ضرور گزاریں گے۔"

جونہی جیپ مون لائٹ ہوٹل کے سامنے رکی۔ انسپکٹر جمشید چونک اٹھے:

"محمود...... فاروق...... اس شخص کو دیکھ رہے ہو۔" انہوں نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ہوٹل سے باہر نکل رہا تھا۔

"اوہ۔" وہ تینوں اسے دیکھ کر چونکے۔

"یہ تو وہی ہے جس نے ٹرین میں آپ کی جیب کاٹی تھی۔"

☆☆

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ آج کس قسم کے بٹوے چوری کر کے لوٹے ہو۔" استاد نے تیسرا پرزہ پھینکتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

"ہم خود حیران ہیں استاد۔"

"کیا اس میز پر تین بچے ہی بیٹھے تھے۔"

"جی نہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت بھی تھی۔"

"تب پھر تم نے ان دونوں کے پرس کیوں نہیں نکالے بچوں کے بٹوؤں میں کیا خاص بات تھی۔" استاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں نے مرد کی جیب پر تین مرتبہ ہاتھ ڈالا۔ مگر وہ پہلے ہی بٹوے کو تھامے ہوئے تھا۔" ایک اچکا بولا۔

"اور میں نے عورت کے پرس کو کھول کر دیکھا تو، وہ خالی تھا۔"

"حیرت ہے۔ آخر یہ لوگ کون ہیں۔ جو ہمیں للکار رہے ہیں۔"

"اس شہر کے تو معلوم نہیں پڑتے تھے۔"

"ہوں...... کل مون لائٹ ہوٹل میں جا کر معلوم کرو۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں یا کہیں اور۔ مجھے یہ خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔"

"اُستاد۔ مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔" ایک اچکا بولا۔

"کیا بات یاد آ رہی ہے تمہیں۔"

"کل میں گاڑی میں بیٹھا دولت پور آ رہا تھا تو ایک آدمی کے ساتھ بیٹھا تھا۔"

"ظاہر ہے کہ تم کسی حیوان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔" استاد نے کہا جس پر سب ہنسنے لگے۔

"تم سنو تو سہی۔ اس مرد کے ساتھ ایک عورت اور تین بچے تھے۔"

"کیا مطلب۔" وہ چونکے۔

"اور میں نے مرد کی جیب میں سے بٹوہ نکال لیا تھا۔"

"بہت خوب۔" استاد نے خوش ہو کر کہا۔

"پھر میں گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی گاڑی سے اتر گیا تھا۔"

"واہ۔ مجھے تم پر فخر ہے۔"

"مجھ پر فخر نہ کرو استاد۔ جب میں نے نیچے اتر کر اس کا بٹوہ جیب سے نکالنا چاہا تو بٹوہ میری جیب میں نہیں تھا۔"

"کیا!" سب حیرت سے چلائے۔

"وہ کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ضرور وہی ہیں جو تمہیں گاڑی میں ملے تھے۔ تب تو ٹھیک رہے گا کہ کل تم ہی مون لائٹ ہوٹل جا کر پتا کرو۔"

"جی بہتر۔"

"ان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہو سکے، کرنا......"

اس کے بعد اچکے اپنی اپنی دن بھر کی کارگزاری بیان کرنے لگے۔

☆☆☆

طاہر کا بٹوہ

"کیا اسے پکڑ لیا جائے۔" ساجد نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔ پکڑنے سے کام خراب ہو جائے گا۔ یہ ہمیں پہچانتا ہے۔ اس لیے تم اس کا تعاقب کرو گے۔"

"شام کا وقت ہے۔ یہ اس وقت اچکوں کے ٹھکانے پر تو جا نہیں رہا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے، یہ اپنے گھر جائے۔ اس طرح ہمیں دو اچکوں کے گھروں کا پتا معلوم ہو جائے گا۔ پھر ہم ان دونوں کی بیک وقت نگرانی کرائیں گے اور اس طرح یہ ہمیں خود اپنے ٹھکانے پر لے جائیں گے۔ کیوں کیسی رہے گی۔"

"بہت خوب۔ تو میں اس کے پیچھے جاؤں۔"

"ہاں۔ لیکن وہ پیدل چل رہا ہے۔ تمہیں جیپ کو یہیں چھوڑنا پڑے گا۔ ویسے بھی جیپ کو دیکھ کر ہوشیار ہو سکتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں پیدل ہی جا رہا ہوں۔" ساجد نے کہا اور جیپ سے اتر کر اس طرف روانہ ہو گیا جہاں سے وہ گیا تھا۔

"آؤ۔ ہم اپنے کمرے میں چلیں۔ آج کا کام ختم۔"

وہ ہوٹل کے اندر داخل ہوئے اور سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ ان کے اٹھتے قدم رک گئے اور کمرے میں کسی کے باتیں کرنے کی

آواز آرہی تھی۔ وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ بیگم جمشید کس سے باتیں کر رہی ہیں۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ بیگم جمشید نے دروازہ کھولا۔ تو اندر انہیں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر ہنس پڑے کہ ٹرانسسٹر آن تھا اور اس پر کوئی عورت کھانے پکانے کی ترکیبیں بتا رہی تھی۔

"ہم تو سمجھے تھے کہ آپ کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔" محمود نے کہا۔

"اور ہم حیران ہوئے تھے کہ یہاں آپ کی جان پہچان کا کون نکل آیا۔"

"آپ کے جانے کے بعد میں نے یہاں اس گاڑی والے جیب کترے کو دیکھا تھا۔" بیگم جمشید بولیں۔

"ہاں۔ ہم بھی اسے دیکھ چکے ہیں۔"

"تو کیا آپ نے اسے پکڑ لیا۔"

"نہیں۔ ساجد اس کا پیچھا کر رہا ہے۔"

"میں تو کہتی ہوں، انہیں ایک ایک کر کے پکڑتے رہیں۔" بیگم جمشید بولیں۔

"اس طرح صرف دو چار ہی پکڑے جا سکیں گے، باقی ہوشیار ہو جائیں گے۔"

"آخر اس شہر میں اتنے جیب کترے آ کہاں سے گئے۔"

"یہی تو دیکھنا ہے۔ اسی لیے تو میں ابھی ان پر ہاتھ نہیں ڈال رہا ہوں۔"

"تو ہم ساجد کے گھر کیوں نہ چلیں۔"

"کیوں؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مجھے ہوٹل میں الجھن سی ہوتی ہے۔ ہر وقت غیر مردوں کا آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے۔"

"تو تم اپنے کمرے میں رہا کرو۔ کھانا بھی یہیں منگوا لیا کرو۔"

"اور آپ نیچے ہال میں کھائیں گے۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں ایک دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ ایک دو دن کے اندر آپ تمام جیب کتروں کو گرفتار کر لیں گے۔"

"خیال تو یہی ہے۔"

"جیب کترے معمولی ذہانت کے نہیں ہیں۔ بہت پھرتیلے بھی ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! لیکن تم دیکھ چکی ہو کہ ان کی کوشش کو تین مرتبہ ناکام بنا چکا ہوں۔"

"کیا اس وقت آپ کا پرس آپ کی جیب میں ہے۔" محمود نے پوچھا۔

"ہاں۔ کیوں۔ کیا تمہارا خیال ہے، نہیں ہوگا۔" انسپکٹر جمشید جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بری طرح چونکے:

"ارے!"

"کیا ہوا۔" چاروں بیک وقت بولے۔ "کیا آپ کا بٹوہ جیب میں نہیں ہے۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن۔ وہ طاہر والا بٹوہ کہاں گیا۔"

"وہ۔ وہ تو میز پر تھا۔ طاہر نے لے لیا ہوگا۔"

"نہیں۔ طاہر اسے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر آخر وہ بٹوہ کہاں چلا گیا۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور سوچ میں کھو گئے۔ چاروں انہیں حیران حیران نظروں

سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆

اچکے پھر اسی ہال میں جمع تھے، اونچی کرسی پر ان کا استاد آنکھوں پر سیاہ شیشوں والی عینک لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک وہ اچکا اندر داخل ہوا جس نے گاڑی والا واقعہ سنایا تھا:

"تم بہت دیر سے آئے۔"

"میرے پیچھے پولیس کا ایک سپاہی لگا ہوا تھا۔ اسے چکمہ دیکر یہاں پہنچا ہوں۔"

"کیا مطلب۔" استاد چونکا۔

"جی ہاں۔ میری نگرانی کل سے شروع ہوئی ہے۔"

"اوہ۔ اچھا۔ ان کے متعلق کیا معلوم ہوا۔"

"کچھ پتا نہیں چلا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں انکا نام مسٹر اینڈ مسز داؤد درج ہے۔"

"تم ایک دم اُلّو ہو۔" استاد نے غصے میں کہا۔

"جی کیا مطلب۔"

"نمبر نو کھڑا ہو جائے۔"

ایک اچکا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جس نے ٹیکسی میں انسپکٹر جمشید کا بٹوہ اڑایا تھا۔

"تم دونوں نے ہم سب کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔"

"کیا مطلب۔" ٹیکسی ڈرائیور چونک کر بولا۔

"اب تمہارا شہر میں گھومنا اچھا نہیں ہے۔ آج سے تم اسی عمارت میں رہو گے۔ یہاں سے ایک منٹ کے لیے باہر نہیں نکلو گے۔"

"لیکن استاد۔ یہاں تو ہمارا دم گھٹ جائے گا۔"

"اور تمہاری وجہ سے اگر ہم سب پکڑے گئے۔"

"آخر کیسے......"

"پوچھ لو نمبر سات سے۔ جس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے، تمہاری نگرانی بھی ہو رہی ہو گی۔"

"تو پھر......"

"تم اب اس عمارت کے ایک کمرے میں بند رہو گے۔ تمہارا کھانا وہیں پہنچ جایا کرے گا۔"

"استاد...... یہ ظلم ہے۔ ہم دم گھٹ کر مر جائیں گے......"

"یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔ ہم خطرے سے آزاد ہو جائیں گے۔"

"کم از کم ہمیں اس عمارت میں تو گھومنے پھرنے کی اجازت دو۔"

"تاکہ تم کھڑکی سے جھانکو اور ہم سب پھنس جائیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"

"آخر بات کیا ہے استاد۔ پہلے تو آپ کبھی پولیس سے اتنا نہیں ڈرے۔"

"تم نہیں جانتے۔ ان دنوں یہاں انسپکٹر جمشید اور اس کے بچے آئے ہوئے ہیں۔"

"کیا!" بیسیوں آوازیں ابھریں۔

"ہاں وہ شخص۔ جس کا نام تم داؤد بتا رہے ہو انسپکٹر جمشید ہے۔"

"اوہ!"

ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

فرزانہ کا خیال

انسپکٹر ساجد ان کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ آپس میں ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ سب انسپکٹر طاہر اندر داخل ہوا۔ دروازے میں داخل ہوتے وقت اسے سر کو کچھ جھکانا پڑتا تھا کیونکہ وہ قد کے معاملے میں بہت خوش نصیب واقع ہوا تھا۔

"کہو انسپکٹر کیا رپورٹ ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"ٹیکسی ڈرائیور رات سے غائب ہے اور ابھی تک وہ واپس نہیں آیا۔"

"کیا مطلب۔ کیا رات اس کے گھر کی نگرانی پر کوئی نہیں تھا۔"

"میں خود نگرانی کر رہا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ گھر میں موجود تھا۔ پھر اس کے مکان کی بتیاں گل کر دی گئیں۔ اس کے بعد میں پندرہ بیس منٹ تک وہاں موجود رہا لیکن وہ گھر سے باہر نہ نکلا جس سے میں یہی سمجھا کہ وہ سو چکا ہے۔ لہٰذا میں وہاں سے چلا آیا۔ صبح سویرے ہی میں دوبارہ وہاں پہنچ گیا۔ لیکن اس مکان میں جب مجھے بہت دیر تک زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو مجھے اندر جا کر دیکھنا پڑا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔"

"تم سے بڑی غلطی ہوئی طاہر۔ تمہیں وہیں رہنا چاہیے تھا۔" ساجد نے کہا۔

"جی ہاں۔ میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں اور سخت شرمندہ ہوں۔" طاہر کا سر شرم سے جھک گیا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی ہمارے پاس ایک ذریعہ اور ہے۔ ساجد تمہارا وہ

کانسٹیبل ابھی تک نہیں آیا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بس آتا ہی ہوگا۔ میں نے اسے کمرے کا نمبر بتا دیا تھا۔"

"کون سا کانسٹیبل سر!" سب انسپکٹر طاہر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کل ہم نے اس شخص کو مون لائٹ ہوٹل سے نکلتے دیکھا تھا جس نے انسپکٹر جمشید کی جیب سے ٹرین میں بٹوہ نکالا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب اس کے گھر تک کیا تھا، پھر میں نے وہاں ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔"

"اوہ سمجھا۔"

"دیکھنا طاہر۔ شاید یہ وہی ہے۔" ساجد نے کہا اور طاہر اٹھ کر دروازہ کھولنے لگا۔ کانسٹیبل اندر داخل ہوا:

"کیا رپورٹ ہے۔"

"میں نے رات اس کا تعاقب کیا تھا۔"

"تو وہ گھر سے نکلا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"کس وقت۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"پونے نو بجے۔"

"پھر۔؟"

"میں اس کے پیچھے چلتا رہا اچانک اس نے سڑک پر سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی روک لی۔ وہ اس میں بیٹھ کر نکل گیا۔ افسوس کہ عین وقت پر مجھے کوئی ٹیکسی نہ مل سکی۔"

"لعنت ہے تم پر۔" ساجد نے غصے کے عالم میں کہا۔

"اس غریب پر بگڑنے کی کیا ضرورت۔ اس میں اس کا کیا قصور۔ ٹیکسی کے پیچھے دوڑ تو نہیں سکتا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے ساجد سے کہا۔ پھر نرمی سے کانسٹیبل سے بولے:

"اچھا کوئی بات نہیں۔ تم واپس اسی جگہ جاؤ۔ اس کے مکان کی نگرانی کرتے رہو۔ جونہی وہ واپس آئے۔ ہمیں فون کر دینا۔ ہوٹل کا نمبر تم مجھ سے معلوم کر لو۔ کمرے کا نمبر تو تمہیں معلوم ہی ہے۔"

"جی ہاں!" اس نے کہا۔

"بس جاؤ۔"

کانسٹیبل کے جانے کے بعد وہ طاہر کی طرف مڑے:

"ٹیکسی ڈرائیور کے مکان کی نگرانی پر کسی کو مقرر کر دیا ہے۔"

"جی ہاں!"

"معلوم ہوتا ہے۔ اچکوں کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہے۔"

"کیا۔؟" ساجد نے پوچھا۔

"یہی کہ کوئی ان کے پیچھے لگ گیا ہے۔"

"انہیں کیسے معلوم ہو گیا۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ان کے پرزوں سے جو انہوں نے اپنے بٹوؤں میں رکھ دیے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"تو کیا۔ ابا جان ہم سے غلطی ہوئی۔" محمود نے شرمندہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ بلکہ جو ہوا۔ اچھا ہی ہوا۔"

"ویسے ابا جان۔ آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"وہ کیا۔؟"

"ان تینوں پرزوں کے علاوہ ٹیکسی ڈرائیور ایک اور ذریعے سے بھی ہوشیار ہو سکتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔"

"ٹیکسیوں کے مالک کی طرف۔ ہم نے اس سے ٹیکسی ڈرائیور کا پتا پوچھا تھا۔"

"اوہ!" انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ "تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ طاہر! فوراً دو آدمی ٹیکسیوں کے مالک کی نگرانی پر بھی لگا دو۔"

"جی بہتر!" طاہر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"اب ایک بات ثابت ہو جاتی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

"اوہ وہ کیا۔؟" ساجد نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ شہر کے تمام اُچکے رات کو نو بجے کے قریب کسی ایک جگہ ضرور اکٹھے ہوتے ہیں۔"

"یہ بات کس بات سے ثابت ہوتی ہے۔" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم اچھے انسپکٹر ہو۔ جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے۔"

"اوہ۔ اب سمجھا۔ ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"ابا جان۔ میں بھی سمجھ گئی۔" فرزانہ بولی۔

"اور میں بھی۔" محمود بولا۔

فاروق کچھ نہ بولا تو انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے۔

"فاروق تم خاموش ہو۔ کیا تم نہیں سمجھے۔"

"میں شیخی نہیں مارتا۔ ان دونوں کی طرح۔ ورنہ میں جانتا ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے گھر سے پونے نو بجے نکلا تھا اور گاڑی والا اچکا بھی پونے نو بجے نکلا تھا۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"بہت خوب۔ کمال ہے۔" ساجد کے منہ سے نکلا۔

☆☆

پھر تین دن گزر گئے۔ ٹیکسیوں کے مالک کی نگرانی تین دنوں سے ہی ہو رہی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور اور گاڑی والا اچکا ابھی تک اپنے اپنے گھر نہیں لوٹے تھے اور ان دنوں میں دولت پور کے کسی شخص کی جیب بھی نہیں کاٹی گئی۔ ٹیکسیوں کا مالک بھی اپنے اڈے اور گھر کے علاوہ کہیں نہ گیا۔

اب انسپکٹر جمشید، ساجد اور تینوں بچے حیران اور پریشان تھے کہ یہ کیا چکر ہے۔ اچکوں کو پکڑنے کے لیے انہوں نے جن دو آدمیوں کو تجویز کیا تھا، اب وہ غائب ہو گئے تھے۔

"آخر وہ غائب کہاں ہو گئے۔" ساجد کہہ رہا تھا۔

"اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم ان کی نگرانی کرا رہے ہیں۔"

"ابا جان۔ ٹیکسیوں کے مالک کو نہ بھولیے۔" فرزانہ بولی۔

"تم تو بس اسی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کس کے پیچھے پڑنا چاہیے۔ اور کون ایسا ہے، جس کے ذریعے سے اچکوں کو یہ معلوم ہوا کہ ہم ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے فرزانہ ٹھیک کہتی ہے۔" محمود نے فرزانہ کا ساتھ دیا۔

"فرزانہ کی رائے میں بھی ایک خرابی ہے۔" انسپکٹر جمشید جو ان کی باتیں بغور سن رہے تھے، بولے۔

"دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا، تمہارا خیال ٹھیک نہیں ہے۔"

"ابا جان نے یہ تو نہیں کہا۔" فرزانہ نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں فاروق۔ فرزانہ کا خیال بالکل ہی غلط نہیں کہا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو پھر اس کے خیال میں کیا خرابی ہے۔" فاروق نے پوچھا۔

"سوال یہ ہے کہ ہم نے ٹیکسیوں کے مالک سے ٹیکسی ڈرائیور کا پتا پوچھا تھا نا۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" ساجد بولا۔

"اور اسے اس کی وجہ بھی بتائی تھی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"پھر اسے گاڑی والے اچکے کے متعلق کیسے معلوم ہوا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ۔ واقعی۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"یہیں آکر فرزانہ کے خیال کی گاڑی بھی رک جاتی ہے۔"

"فرض کر لیجیے۔۔۔۔۔" فرزانہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"بس بس فرض نہ کرنا۔ ورنہ کام خراب کرو گی۔" فاروق نے اسے روکا۔

"ہاں! کیا فرض کریں۔" انسپکٹر جمشید نے دلچسپی لینے والے انداز میں کہا۔

"فرض کیجیے۔ ٹیکسیوں کا مالک ہی اچکوں کا سردار ہے۔ وہ سب تین روز پہلے رات کو اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے اپنی اپنی کہانی اسے سنائی۔ پھر اچکوں کے سردار کو یہ یاد آیا کہ ہم اس ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ فوراً بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جان گیا کہ گاڑی والے اچکے کو بھی ہم ہی ٹکرائے تھے۔"

"زندہ باد۔ فرزانہ زندہ باد۔ اس سے زیادہ جان دار اندازہ لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ کیوں ساجد۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں۔"

"حیرت انگیز۔ فرزانہ کا ذہن واقعی بہت تیز ہے۔"

"جی ہاں۔ تلوار سے بھی تیز۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"جل گئے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"مجھے کیا پڑی ہے جلنے کی۔ جلنے کے لیے اور بہت سی چیزیں ہیں۔" اس نے

بدستور جل کر کہا۔

"مثلاً۔؟" فرزانہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"مثلاً کوئلہ۔ لکڑی۔ گیس۔"

"بس بس۔ کہیں سب کچھ نہ جلا بیٹھنا۔" محمود نے گھبرا کر کہا اور اس کے انداز پر سب کو ہنسی آ گئی۔

"لیکن معاملہ پھر اٹک جاتا ہے۔" ساجد بولا۔

"وہ کیسے؟" محمود نے چونک کر پوچھا۔

"ٹیکسیوں کے مالک کی نگرانی برابر تین دن سے ہو رہی ہے۔ اگر وہ اچکوں کا سردار ہے تو رات کے وقت وہ اچکوں کی میٹنگ میں کیوں نہیں گیا۔"

"احتیاط کے خیال سے۔"

"کیا مطلب۔؟"

"اسے معلوم ہے کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر کیا کیا جائے۔"

"نگرانی بدستور جاری رہے گی۔"

"بہت اچھا۔ ایسا ہی ہوگا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" ساجد اٹھ کھڑا ہوا۔

"ذرا طاہر کو میرے پاس بھیج دینا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیوں۔ اس کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"اس سے کچھ معلوم کرنا ہے۔"

"اچھا۔" وہ دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ طاہر دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

☆☆☆

واپسی کا پروگرام

"تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ تمہیں تو ٹیکسیوں کے اڈے کے آس پاس ہونا چاہئے تھا۔" ساجد کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"جی ہاں! میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ دراصل میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ تین دن سے یہ نگرانی ہو رہی ہے، اب تک تو کوئی خاص بات معلوم ہوئی نہیں۔ کیا نگرانی جاری رہے گی۔"

"ہاں۔ نگرانی بدستور جاری رہے گی کیوں جمشید۔ تم کیا کہتے ہو۔"

"بالکل۔ نگرانی ہر حال میں جاری رہے گی۔"

"بہت بہتر۔ پھر تو میں وہیں پہنچتا ہوں۔" طاہر جانے کے لیے مڑا۔

"ذرا ٹھہرنا انسپکٹر۔ مجھے تم سے کچھ معلوم کرنا ہے۔"

"جی فرمائیے۔" طاہر رک کر بولا۔

"میں نے تین دن پہلے تمہارا جو پرس تمہاری جیب میں سے نکالا تھا، کیا وہ تم نے ہی میز سے اٹھایا تھا۔"

"جی۔ جی نہیں تو۔ میں نے نہیں اٹھایا تھا۔"

"کمال ہے۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا بات ہے؟" ساجد نے پوچھا۔

"وہ پرس کمرے سے غائب ہے۔ اچھا انسپکٹر۔ اگر وہ پرس تم نے نہیں اٹھایا تو پھر تم نے اپنا پرس مجھ سے کیوں نہیں مانگا۔" انسپکٹر جمشید نے طاہر سے سوال کیا۔

"دراصل مجھے خیال نہیں رہا۔ ابھی آپ کے ذکر کرنے پر یاد آیا۔ دوسری بات یہ کہ اس میں کوئی بڑی رقم بھی نہیں تھی۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ شاید اس میں چار سو چالیس روپے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے یاد آ گیا۔ اتنے ہی تھے۔"

"خیر۔ میں اسے ایک بار پھر اپنے کمرے میں تلاش کروں گا اگر مل گیا تو تمہیں واپس کر دوں گا۔"

"شکریہ!" طاہر نے کہا۔ "کیا اب میں جا سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ ضرور!"

طاہر کمرے سے نکل گیا تو انسپکٹر جمشید بولے۔

"تمہارا اسسٹنٹ بہت چست آدمی ہے، مجھے بہت پسند ہے۔ مگر دو تین سال پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو شاید یہ تمہارے ساتھ نہیں تھا۔"

"ہاں۔ اس وقت راشد تھا۔ یہ تو ابھی چند ماہ پہلے ہی آیا ہے۔"

"بہت ذہین آدمی ہے۔"

"لیکن افسوس ہے ہم دونوں مل کر ایک اچکا بھی نہیں پکڑ سکے۔" ساجد نے ہنس کر کہا۔

"دونوں کی بجائے تینوں کہو۔ کیونکہ اب میں بھی شامل ہو گیا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ابا جان۔ آپ ہمیں بھول رہے ہیں۔" فاروق نے شریر انداز میں کہا۔

"تو پھر اب یہ کہا جائے گا کہ ہم چھ آدمی مل کر ایک اچکے کو بھی نہیں پکڑ سکے۔" فرزانہ نے نتیجہ نکالا۔

"تم نتیجہ نکالنے میں بڑی تیز ہو۔" محمود نے تعریف کی۔

"کہیں اس سے امتحان کا نتیجہ نہ نکلوا لینا۔" فاروق ہنسا۔

"مجھے اور تمہیں بغیر کھٹکے فیل کر دے گی۔"

"اور خود الجبرے میں فیل ہو جائے گی۔" محمود نے کہا۔

"دیکھو۔ دیکھو۔ الجبرے کا نام نہ لینا۔ مجھے اس کے نام سے ہی چڑ ہے۔"

"جب کہ ہم الجبرے کے پرچے میں سو میں سے سو نمبر حاصل کرتے ہیں۔" فاروق ہنسا۔

"اسی جگہ تو میں مار کھا جاتی ہوں۔" فرزانہ نے مایوسی سے کہا۔

"بھئی تمہارے بچے بہت تیز ہیں۔" ساجد نے تعریف کی۔

"انکل۔ کوئی چیز کاٹنے کا ارادہ تو نہیں۔" فاروق نے کہا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

☆☆

دو دن اور گزر گئے اور انہیں اچکوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ شہر میں کسی کی جیب نہیں کاٹی گئی۔ تنگ آ کر انسپکٹر جمشید نے اپنا بٹوہ نوٹوں سے بھرا اور جیب میں ڈال کر اسی طرح ہوٹل سے نکلے کہ بٹوہ جیب میں صاف نظر آ رہا تھا۔ اور کسی جیب کترے کے لیے اسے نکال لینا مشکل نہ تھا۔ سارا دن پیدل شہر بھر کی خاک چھانتے پھرے لیکن ان کے بٹوے کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ شام کو جب وہ واپس ہوٹل پہنچے تو ان کے کمرے میں انسپکٹر ساجد اور طاہر موجود تھے۔ ان دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

"تم سارا دن کہاں غائب رہے۔" ساجد نے پوچھا۔

"بس یار، کیا بتاؤں۔ میں اچکوں کو دعوت دیتا پھرا کہ آؤ اور میرا بٹوہ نکالو۔ لیکن نہ جانے اس شہر کے جیب کتروں کو کیا ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سارے کے سارے کئی دنوں کے لیے سو گئے ہوں یا پھر شہر چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔"

"مجھے بھی اسی پر حیرت ہے۔ پانچ دن سے کسی کی جیب نہیں کاٹی گئی۔"

"اب تو میں ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اور وہ کیا۔" ساجد نے پوچھا۔

"شہر کے اچکے یہ شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" وہ بولے۔

"آخر کیوں۔؟" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ انہیں یہاں میری آمد کی اطلاع ہو گئی ہے۔ اب میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کسی کو اطلاع دے کر نہیں آئے، ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا اصل نام نہیں لکھوایا۔ پھر جیب کتروں کو خبر کیسے ہو سکتی ہے۔"

"بہر حال۔ میں اس کیس میں اپنی مکمل ناکامی کا اعتراف کرتا ہوں، اور اسی وقت واپس جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ ویسے بھی میں ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا تھا جو ختم ہو رہی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" ساجد ہی نہیں، محمود، فاروق، فرزانہ، بیگم جمشید اور طاہر تک حیران رہ گئے۔

"ہاں بھئی۔ مجھے افسوس ہے۔ ویسے تم مطمئن رہو۔ اب جیب کترے اس شہر سے رخصت ہو چکے ہیں۔"

"مگر تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ دو چار دن میرے ہاں

بھی رہو گے۔ میرے بیوی بچے ہر روز تم لوگوں کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں۔ پہلے تمہیں وہاں چل کر رہنا ہو گا۔"

"بھئی۔ وہ تو میں نے اس صورت میں کہا تھا، جب ایک دو دن میں جیب کترے پکڑے جاتے۔ دراصل انہوں نے اپنی سرگرمیاں ہی بند کر دی ہیں۔ وہ ضرور یہ شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ بس اب ہمیں اجازت دو۔ اس وقت چار بجے ہیں۔ گاڑی چھ بجے جاتی ہے، دو گھنٹے ہیں ہمارے پاس۔ اتنی دیر میں ہمیں تیار بھی ہونا ہے اور ہوٹل کا حساب بھی بے باق کرنا ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گا۔" ساجد ضد پر اڑا ہوا تھا۔

"دیکھو مجبور نہ کرو۔ پرسوں مجھے دفتر میں حاضری دینی ہے۔ میں پھر کبھی بیوی بچوں کے ساتھ آ کر تمہارے ہاں کچھ دن گزار کر جاؤں گا۔"

"پکا وعدہ رہا۔" ساجد مطمئن ہو کر بولا۔

"ہاں۔ بالکل۔ پکا۔"

"اچھا۔ اس وقت تو میں چلتا ہوں کیونکہ تمہیں تیاری کرنی ہے۔ ٹھیک پونے دو گھنٹے کے بعد میں جیپ لے کر پہنچ جاؤں گا۔ جیپ میں اسٹیشن تک چلیں گے۔"

"نہیں۔ تم جیپ لے کر نہ آنا۔ ٹیکسی میں آنا یا پیدل۔" انسپکٹر جمشید نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ کیوں؟" ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ جیپ تمہیں سرکاری کاموں کے لیے دی گئی ہے نہ کہ ذاتی کاموں کے لیے۔ اسے صرف سرکاری کاموں کے سلسلے میں استعمال کیا کرو۔"

"اوہ۔ کیا تم اس حد تک ایمان دار ہو۔" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ساجد بھائی۔ یہ تو گھر میں ٹیلیفون تک نہیں لگواتے۔"

"اچھا۔ حیرت ہے۔" ساجد اور طاہر آنکھوں میں حیرت لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ابا جان۔ یہ کیا۔ آپ نے ایک دم واپسی کا پروگرام بنالیا۔" فرزانہ نے ان کے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

"اور کیا کریں بیٹی۔ مجبوری ہے، چھٹی ختم ہو رہی ہے اور جیب کترا کوئی پکڑا نہیں گیا۔ ان حالات میں واپس نہ جاؤں تو کیا کروں۔ میرا خیال تھا کہ ایک آدھ دن میں ہی تمام جیب کتروں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میرے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ جیب کترے معمولی ذہانت کے مجرم نہیں ہیں۔ یا پھر کوئی بہت ہی ذہین آدمی انہیں کنٹرول کر رہا ہے اس لیے میں ایک بھی جیب کترے کو گرفتار نہیں کر سکا۔ اب ہم واپس نہ جائیں تو کیا کریں۔ یہاں رہ کر فائدہ کیا۔"

"اخبار والے آپ کی ناکامی کو نمایاں سرخیوں میں چھاپیں گے۔" محمود بولا۔

"کیوں۔ بھلا اخبار والے کیسے چھاپ سکتے ہیں۔ کسے معلوم ہے کہ میں یہاں آیا تھا۔"

"اوہ ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا۔"

"بس اب باتیں ختم۔ سامان باندھو سامان۔ ہمیں جانا بھی ہے۔"

ان حالات میں کسی کا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ مجبور تھے۔

☆☆☆

گاڑی کے ٹکٹ

ٹھیک پونے دو گھنٹے کے بعد ساجد ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

اس مرتبہ طاہر اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"کیا تم تیار ہو چکے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہم بالکل تیار ہیں۔ بس تمہارا انتظار تھا۔"

"تو چلو پھر۔ گاڑی میں صرف پندرہ منٹ کی دیر ہے۔"

وہ ہوٹل سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھے اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

"کیا تم اپنا ارادہ بدل نہیں سکتے۔" ساجد نے ٹیکسی میں پوچھا۔

"نہیں۔"

"آخر کیوں۔"

"کل میری آخری چھٹی ہے۔"

"چھٹی کا کیا ہے۔ بذریعہ تار بھی لی جا سکتی ہے۔" ساجد نے اعتراض کیا۔

"لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ وہاں بھی کئی کام مجھے انجام دینے ہیں۔"

"لیکن یار...... یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یکایک یہ اچکوں کو ہوا کیا۔" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈر گئے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تم سے۔" ساجد بھی مسکرایا۔

"تو کیا تم سے ڈرے ہیں۔ تم تو یہاں پہلے سے موجود ہو۔"

"اگر تمہارے جانے کے بعد انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔"

"بے فکر رہو۔ میں پھر آؤں گا اور اس مرتبہ اتنی خاموشی سے آؤں گا کہ میرے سوا کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ تمہیں بھی نہیں۔"

"مجھے بھی نہیں...... کیوں...... مجھے خبر کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"کیا پتا۔ جیب کتروں کے سردار تمہی ہو۔"

ان کی اس بات پر ٹیکسی میں ایک قہقہہ گونجا:

"بہت خوب۔ ویسے مجھے تمہارے اس طرح جانے کا افسوس بہت ہے۔"

"اس میں افسوس کی کیا بات۔"

"کاش۔ جیب کترے پکڑے جاتے۔"

"خدا کو یہی منظور تھا۔" انسپکٹر جمشید نے صابر وشاکر لہجے میں کہا۔

"میں ڈرتا ہوں۔ کہیں کل سے ہی وارداتیں شروع نہ ہو جائیں۔"

"پروا نہ کرو۔"

"پروا کیسے نہ کروں۔ تم تو جا رہے ہو۔ کم از کم تمہارے آنے سے اتنا تو ہو ہی گیا تھا کہ جیب کترے اپنی حرکتوں سے باز آ گئے تھے۔"

"وہ باز ہی رہیں گے، مجھے یقین ہے۔"

ٹیکسی اسٹیشن کے سامنے رکی اور وہ اتر پڑے۔

ساجد ٹکٹ لینے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ انسپکٹر جمشید نے اسے روک دیا:

"نہیں۔ ٹکٹ میں خود لوں گا۔"

"ارے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"نہیں۔ تم بچوں کے پاس ٹھہرو۔" انہوں نے کہا اور بکنگ کی کھڑکی کے پاس چلے گئے۔ ٹکٹ لے کر واپس آئے اور سب پلیٹ فارم پر پہنچے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ وہ سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ رش کم تھا اور اس ڈبے میں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

آخر گاڑی نے وسل دی۔ جونہی گاڑی رینگنے لگی انہوں نے ہاتھ ہلائے اور اس وقت ساجد کی آنکھوں میں دو آنسو جھلملا اٹھے۔

تینوں بچے اداس تھے۔ انہیں انسپکٹر جمشید کا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے باپ کے سامنے زبان کھولنے کی تربیت نہیں پائی تھی۔ مجبور تھے اور خاموش بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ہر چیز گھومتی ہوئی ان کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو رہی تھی۔

"تم خاموش ہو۔" آخر انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی۔" فاروق صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"تمہیں میرا اس طرح چلا آنا اچھا نہیں لگا۔ یہی بات ہے نا۔"

"جی۔ جی نہیں تو۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ یہی بات ہے۔"

"آپ ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"اور تم۔ بیگم۔ تم بھی تو کچھ بولو۔ تم بھی خاموش ہو۔"

"کیا بولوں۔ جب بچے ہی خوش نہیں ہیں۔"

"ارے بھئی اس میں اداس ہونے والی کونسی بات ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔"

"نہیں ابا جان۔ ہم اداس تو نہیں ہیں۔"

"تو پھر بولو۔ باتیں کرو۔ ہنسو۔ چہکو....."

"فاروق اور محمود ہی کچھ چپ چاپ ہیں۔ میں تو بالکل خوش ہوں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"جی ہاں۔ تم تو کبھی اداس ہو ہی نہیں سکتیں۔" فاروق نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

"کیوں۔ ہو کیوں نہیں سکتی۔ کیا میں انسان نہیں ہوں۔"

"ارے! تم انسان ہو۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

انسپکٹر جمشید ان کے موڈ کو بدلتے دیکھ کر خوش ہوئے۔

"ہاں اب آئے ہو نا تم اپنے اصل راستے پر۔ تمہاری یہی باتیں تو اچھی لگتی ہیں۔"

"ابا جان۔! آخر جیب کتروں کو آپ کے متعلق کیسے معلوم ہو گیا۔"

"سوچو۔ ذہن پر زور دو۔"

"تو کیا آپ کو معلوم ہے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں بھئی۔ میں تو جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن دولت پور میں تو آپ نے اس کا اظہار نہیں کیا۔"

"کیا فائدہ تھا۔ اچکے اور ہوشیار ہو جاتے۔"

"لیکن ہم تینوں اس بات کو کیوں نہیں سمجھ سکے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"اس کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔" فاروق نے کہا۔

"وہ کیا۔" فرزانہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ہم تینوں کے دماغوں میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"دیکھو۔ تم صرف اپنے دماغ کے متعلق کہہ سکتے ہو۔ ہم دونوں کے نہیں۔" محمود نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اگر تم دونوں کے دماغوں میں بھوسہ نہیں بھرا ہے تو بتاؤ۔ اچکوں کو کیسے ابا جان کی آمد کا پتا چل گیا۔"

"یہ بات تو واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تو پھر اس بات کو تسلیم کر لو۔ کہ دماغوں میں بھوسہ بھرا ہے۔"

"اچھا۔ تم مجبور کرتے ہو تو تسلیم کر لیتے ہیں۔" فرزانہ نے مسمسی صورت بنا کر کہا جس پر سب کو ہنسی آ گئی۔

اچانک انسپکٹر جمشید نے اپنی جیب سے گاڑی کے ٹکٹ نکالے اور بولے۔

"بھئی یہ اپنا اپنا ٹکٹ لے لو۔"

"اپنے پاس ہی رکھیے ابا جان۔ ہم کیا کریں۔"

"نہیں بھئی۔ تم اپنا ٹکٹ اپنے پاس رکھو۔" انہوں نے ان کو ایک ایک ٹکٹ دیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے حیران ہو کر ٹکٹ لے لیے۔ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ ٹکٹ ان کو دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اچانک محمود اپنی سیٹ سے اچھل پڑا۔

"کیوں۔ تمہیں بچھو نے کاٹا ہے۔" فاروق نے اس کا مذاق اڑایا لیکن اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو حیران حیران نظروں سے ٹکٹ کو دیکھے جا رہا تھا۔

فاروق اور فرزانہ نے بھی اپنے اپنے ٹکٹ دیکھے اور پھر ان کی بھی وہی حالت ہوئی۔ وہ دونوں بھی بری طرح اچھلے۔

اب تو بیگم جمشید بھی نہ رہ سکیں۔ ٹکٹ جو انہوں نے اپنے پرس میں رکھ لیا تھا، نکال کر دیکھا، دوسرے ہی لمحے ان کا بھی وہی حال ہوا۔

☆☆☆

مجرم

وہ متحیرانہ انداز میں آنکھیں پھاڑے انسپکٹر جمشید کو دیکھے جا رہے تھے۔

"کیا بات ہے بھئی۔ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔" آخر انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔ ان کی مسکراہٹ میں حد درجے شوخی رچی تھی۔

"یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں ابا جان۔" آخر محمود بولا۔

"ارے! تو پھر؟" انسپکٹر جمشید نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"یہ تو دولت پور سے صرف اگلے اسٹیشن کے ہیں۔" فاروق بولا۔

"اور جو آنے والا ہے۔ اترنے کی تیاری کرو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہم اس کا مطلب نہیں سمجھے۔" فرزانہ نے اُلجھ کر کہا۔

"اوہ! میں سمجھ گیا۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"کیا سمجھ گئے تم!" فرزانہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم واپس دولت پور جائیں گے۔"

"ابا جان۔ کیا فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"ہاں۔ اس کا خیال ٹھیک ہے۔"

"آخر یہ آپ کو سوجھی کیا۔" بیگم جمشید بول پڑی۔

"بات صرف اتنی سی ہے کہ اچکوں کو میری آمد کا پتا چل گیا تھا لہٰذا انہوں نے

وارداتیں کرنا بند کر دیں۔ ایسی صورت میں ان کو پکڑنا مشکل ہو گیا تھا۔ اب میں ان کے خیال میں دولت پور سے چلا آیا ہوں۔ اس لیے وہ پھر سے اپنا کام چالو کر دیں گے۔" انہوں نے بتایا۔

"لیکن انہیں یہ کیسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم دولت پور سے جا چکے ہیں۔"

"جیسے میری آمد کا علم ہو گیا تھا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ ضرور ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔" فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہاں! اچھا تو میں بہت کچھ رہا ہوں۔"

"آخر آپ کا پروگرام کیا ہے۔" محمود نے پوچھا۔

"دولت پور جائیں گے بھئی دوبارہ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ویری گڈ۔ یہ ہوئی نا بات۔ میں بھی حیران تھا کہ ابا جان اتنی آسانی سے ہار ماننے والے تو ہیں نہیں انہیں ہو کیا گیا ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا۔" فاروق بولا۔

"شکر ہے خدا کا۔ مجھے تو یہ ناکامی بُری طرح کھٹک رہی تھی۔" فرزانہ بولی۔

"جی ہاں۔ مجھے بھی ڈرا رہی تھی۔" محمود نے اس کی نقل اتاری۔

"اب سامان اٹھا لو۔ اسٹیشن آنے والا ہے۔"

"کیا ہم اس قصبے میں ٹھہریں گے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہاں ٹھہر کر کیا کریں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہی ایک گاڑی دوسری طرف سے آئے گی۔ اس میں بیٹھ کر دولت پور جائیں گے۔"

"بہت خوب۔ اب آیا مزا۔"

اسی وقت گاڑی نے وسل دی اور آہستہ ہونے لگی، یہاں تک کہ رُک گئی۔ یہ کوئی قصبہ تھا۔ وہ گاڑی سے اتر آئے اور پلیٹ فارم پر پڑے بنچوں پر بیٹھ گئے۔

"تم بیٹھو۔ میں ٹکٹ لے آؤں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

پندرہ منٹ بعد دولت پور جانے والی ایک گاڑی اسٹیشن پر آ کر رکی اور وہ اس میں سوار ہو گئے۔ ایک گھنٹے بعد ہی دوبارہ دولت پور کے اسٹیشن پر اتر رہے تھے اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھے ایک ہوٹل کا رخ کر رہے تھے لیکن اس مرتبہ ان کا رخ مون لائٹ ہوٹل کی طرف نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ انہوں نے ناشتا بھی کمرے ہی میں منگوایا۔

"نیچے ہال میں کیوں نہ چلیں۔" محمود بولا۔

"تم تو بے وقوف ہو اچھے بھلے۔" فاروق بول اٹھا۔

"اچھا۔ یہ کس بات سے ظاہر ہوا۔"

"نیچے جانے کے خیال سے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہمیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے بچا کر رکھنا ہو گا تاکہ اچکوں کو یہ پتا نہ چلے کہ ہم واپس آ چکے ہیں۔"

"فاروق ٹھیک کہہ رہا ہے محمود......"

"جی ہاں۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہ غلط کہہ رہا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"لیکن ابا جان۔ اچکوں کو پکڑنے کے لیے ہمیں آخر باہر تو نکلنا ہی پڑے گا۔" فرزانہ بولی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی تو ہم یہ دیکھیں گے کہ اچکے دوبارہ وارداتیں شروع کرتے ہیں یا نہیں۔"

"اگر انہوں نے دو چار دن تک کوئی حرکت نہ کی تو کیا ہم کمرے ہی میں بند رہیں گے۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں۔ اس صورت میں ہم اپنے چہروں میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لیں گے۔"

"مثلاً۔؟" فاروق نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ میں مونچھیں لگا لوں گا۔ اور تم تینوں کے چہرے میں تو کوئی خاص تبدیلی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تھوڑا بہت فرق ڈال دیا جائیگا۔"

"بہت خوب۔ اب آئے گا جاسوسی کا مزا۔" فاروق خوش ہو گیا۔

اسی طرح لڑتے جھگڑتے اور نوک جھونک کرتے شام ہو گئی۔ آخر انسپکٹر جمشید نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔

"یس سر!" بیرے نے اندر آ کر پوچھا۔

"بھئی ذرا شام کا اخبار تو لا دو۔" انہوں نے بیرے کو پانچ روپے کا سکہ دیتے ہوئے کہا۔

"جی بہتر۔" بیرا چلا گیا۔

"آپ اخبار کا کیا کریں گے۔" محمود نے پوچھا۔

"دیکھوں گا کہ پروگرام شروع ہو گیا ہے یا نہیں۔"

"جیب کتروں کا؟" فاروق بولا۔

"ہاں!"

اسی وقت بیرا اخبار لیے اندر داخل ہوا، اور میز پر ڈال کر چلا گیا، وہ سب ایک ساتھ اخبار پر جھک پڑے۔ پھر سرخی دیکھ کر چونک اٹھے۔ یہ دولت پور کا مقامی اخبار تھا۔ سرخی تھی۔

"سات دن کے بعد جیب کاٹنے کی وارداتیں پھر شروع ہو گئیں۔"

"آج چھ آدمیوں کے بٹوے اڑا لیے گئے۔"

"لو بھئی۔ پروگرام شروع ہو گیا۔ اب ہمیں بھی آج سے ہی اپنا کام شروع کرنا پڑے گا۔"

"اب کیا پروگرام ہے۔"

"تمہاری امی یہیں رہیں گی اور ہم چاروں باہر چلیں گے۔"

"تو پھر چلیے۔"

"ابھی نہیں۔ مغرب کے بعد۔"

مغرب کے بعد وہ ہوٹل سے باہر نکلے۔

"کہاں چلنا ہے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔ آج ہم ان کا ٹھکانا معلوم کر کے رہیں گے۔"

انسپکٹر جمشید بولے۔ اس وقت ان کے چہرے پر مصنوعی مونچھیں لگی ہوئی تھیں۔ فاروق کے منہ پر دائیں طرف ایک سیاہ رنگ کا ابھرا ہوا تل بنا ہوا تھا، محمود کی ناک کی نوک پر ایک سیاہ رنگ کا دھبہ سا تھا اور فرزانہ کے گال پر زخم کا نشان تھا۔ ان معمولی تبدیلیوں سے وہ کافی بدلے بدلے نظر آ رہے تھے اور پہلی نظر میں پہچانے نہیں جاسکتے تھے۔

پیدل چلتے ہوئے وہ ایک عمارت کے سامنے پہنچے۔

"اس کے دروازے پر نظر رکھنا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"یہاں کون رہتا ہے۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"وہی ٹیکسی ڈرائیور۔ تم تینوں اس کا تعاقب کرو گے۔"

"اور آپ......؟" محمود نے پوچھا۔

"میں بعد میں آؤں گا۔" ٹھیک پونے نو بجے ٹیکسی ڈرائیور عمارت سے باہر نکلا۔

"وہ باہر آ رہا ہے۔ ہوشیاری سے اس کا تعاقب کرو۔ اور یہ ٹیکسی میں جائے تو تم بھی کوئی ٹیکسی پکڑ لینا۔"

"جی بہتر۔" تینوں اس طرف چل پڑے، جس طرف ٹیکسی ڈرائیور تھا۔

ان کے جانے کے بعد وہ بھی وہاں سے چل پڑے اور ایک دوسری عمارت کے سامنے رُکے۔ جلد ہی وہاں سے بھی ایک آدمی نکلا۔ اس کے پیچھے چل پڑے۔

وہ شخص پیدل چلتا رہا۔ آخر بیس منٹ تک چلنے کے بعد ایک عمارت کے سامنے رکا۔ اسے رکتے دیکھ کر انسپکٹر جمشید ایک عمارت کی اوٹ ہو گئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت ہلکی سی آواز آئی۔

"ابا جان! ہم یہاں ہیں۔" وہ چونک کر مڑے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر تینوں دیوار سے لگے اندھیرے میں کھڑے تھے۔

"تو وہ بھی اسی مکان میں گیا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ کون تھا۔ جس کے پیچھے آپ آئے ہیں۔" محمود نے کہا۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے کیونکہ اس نے کوٹ کے کالر کھڑے کیے ہوئے تھے۔

"اُچکوں کا سردار!"

"کیا!" ان تینوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

☆☆☆

تین کھلونے

انسپکٹر ساجد ایک بار پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ انسپکٹر جمشید کے جاتے ہی جیب کاٹنے کی وارداتیں شروع ہو گئیں تھی۔ کل سے اس کا پھر ناک میں دم آیا ہوا تھا۔ کل چھ آدمیوں کی جیبیں کاٹ لی گئی تھیں اور آج بھی صبح سے لٹنے والے آ رہے ہیں۔ اس نے شہر میں سب انسپکٹر طاہر اور تمام کانسٹیبلوں کو دوڑایا ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ تنہا بیٹھا تھا۔ صرف تھانے کے دروازے پر رائفل بدست کانسٹیبل کھڑا تھا۔

اچانک ایک لڑکا تھانے میں داخل ہوا اور پہرے دار کو خاطر میں لائے بغیر اندر گھسنے لگا:

"اے۔ کدھر جا رہے ہو۔"

"اندر۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"چلو بھاگو۔ یہ تھانہ ہے۔ کوئی پرچون کی دوکان نہیں ہے۔"

"یہ تھانہ ہے اسی لیے تو اندر جا رہا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔

"کیا مطلب۔ کون ہو تم۔"

"میرے پاس تمہارے تھانے دار کے لیے ایک خط ہے۔"

"لاؤ مجھے دو۔"

"ہرگز نہیں۔ خط دینے والے نے کہا تھا کہ صرف تھانے دار کو دوں۔ اس نے

مجھے اس کام کے بدلے دس روپے بھی دیے تھے۔"

"خط مجھے دو...... میں اندر دیتا ہوں۔" پہرے دار نے نرم لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہونے لگا لیکن پہرے دار نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

"چھوڑ دو مجھے۔"

"خط مجھے دو۔ ورنہ اندر بند کر دوں گا۔ بدتمیز کہیں کا۔"

"خبردار۔ مجھے بدتمیز نہ کہنا۔" لڑکا غرایا۔

شور کی آواز ساجد کے کانوں میں پہنچ گئی۔

"کیا بات ہے" اس نے اندر سے کہا۔

"جناب۔ یہ ایک خط ہے آپ کے نام۔"

"اندر لے آؤ۔" ساجد نے کہا۔

لڑکے نے ہنس کر پہرے دار کی طرف دیکھا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے خط میز پر رکھ دیا اور واپس مڑنے لگا۔

"ٹھہرو۔ تم یہ خط کہاں سے لائے ہو......" ساجد نے پوچھا۔

"جی۔ یہ مجھے ایک راہ گیر نے دیا تھا۔ اور یہاں پہنچانے کی تاکید کی تھی۔"

"اچھا! ٹھہرو...... میں دیکھ لوں۔ اس میں کیا لکھا ہے۔ شاید تم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پڑے۔" ساجد نے کہا، لفافہ اٹھا کر چاک کیا اور اس میں سے پرچہ نکال کر پڑھنے لگا تھا:

"اگر تم اچکوں کو پکڑنا چاہتے ہو تو برٹن روڈ کی گیارہویں عمارت کے پاس آج رات نو بجے آ جاؤ۔ لیکن بالکل تنہا آنا...... اپنے علاوہ کسی دوسرے کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دینا، ورنہ ایک بھی اچکا نہیں پکڑا جا سکے گا۔ اور تم ساری عمر پچھتاتے رہو

گے۔ یاد رکھنا کسی کو نہ بتانا۔"

"وہ آدمی کس قسم کا تھا۔ اس کا حلیہ بتا سکتے ہو۔" ساجد نے خط پڑھنے کے بعد لڑکے سے کہا۔

"جی۔ لمبا چوڑا سا تھا۔ سوٹ پہنے ہوئے۔"

"چہرہ کیسا تھا۔"

"اتنا تو مجھے یاد نہیں رہا۔ دراصل میں دھیان نہیں دے سکا تھا۔"

"اچھا! شکریہ۔ تم جا سکتے ہو۔"

لڑکا باہر آیا، جاتے جاتے سامنے مڑ کر پہرے دار کو دیکھا اور شوخ انداز میں مسکرا کر بولا۔

"آداب عرض ہے۔" یہ کہہ کر وہ تقریباً بھاگتا ہوا ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ اور سیدھا ایک میز کی طرف بڑھا۔ یہاں انسپکٹر جمشید، فرزانہ اور فاروق کے ساتھ بیٹھے تھے۔

"کیوں...... محمد...... دے آئے خط!" انسپکٹر جمشید نے اس لڑکے سے پوچھا جو دراصل محمود تھا۔

"جی ہاں۔"

"ساجد نے تمہیں پہچانا تو نہیں۔"

"جی نہیں۔"

"بہت خوب۔"

☆☆

رات تاریک تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے ایسے میں برٹن روڈ کی عمارت نمبر گیارہ کے کمرے میں تمام اُچکے جمع تھے۔ انکا استاد بھی، پی کرسی پر اجمان تھا۔ وہ باری باری کھڑے ہو کر انہیں اپنے ہنروں کی تفصیل بتا رہے تھے۔

ہنوے اچھل رہے تھے، ان کا استاد سوچ رہا تھا کہ اچانک ہال میں ایک تیز آواز گونجی:

"خبردار۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ تم سب اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

وہ چونک اٹھے۔ ہال کے دروازے میں انسپکٹر ساجد پستول لیے کھڑا تھا۔ پستول کی نالی اٹھی ہوئی تھی۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

"بہت خوب۔ ہم دس گیارہ ہیں۔ اور تم تنہا۔ انسپکٹر بہتر یہ ہے کہ تم اپنا پستول نیچے گرا دو۔" استاد نے مسکرا کر کہا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ میں تنہا ہوں۔"

"تو کیا اپنے ساتھ سکندر کی فوج لائے ہو۔" استاد نے ہنس کر کہا۔

"خاموش۔ ورنہ سب سے پہلے گولی تمہارے ہی سر میں گھسے گی۔"

"تم بھول رہے ہو۔ اب یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ مگر میں حیران ہوں۔ تم اندر کیسے آئے۔ دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار کہاں گیا۔"

"میں اسے گہری نیند سلا آیا ہوں۔ وہ تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔" ساجد مسکرایا۔

"اوہ! تم اسے بے ہوش کر آئے ہو۔"

"ہاں۔"

سودا کر لو انسپکٹر۔ ہم آج کی ساری کمائی تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔" استاد نے ہار مان کر کہا۔

"میں حرام کی کمائی پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"اچھا! میں تمہیں دس لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔"

"خاموش رہو۔ مجھے ایسی کمائی نہیں چاہیے۔"

"تم دیکھو تو سہی۔ یہ دیکھو میری میز کی دراز میں کتنی دولت ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میز کی دراز کو کھول ڈالا۔

"خبردار۔ میز پر سے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

مگر اتنی دیر میں استاد پستول اٹھا کر فائر کر چکا تھا۔ گولی ساجد کے پستول پر لگی اور وہ اس کے ہاتھ سے اچھل کر زمین پر گرا جسے ایک اُچکے نے دوڑ کر اٹھالیا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" استاد غرایا۔

"ابھی نہیں۔" پیچھے سے ایک آواز آئی۔ وہ سب چونک کر مڑے۔ ایک لڑکی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی۔

"یہ کیا چکر ہے..... کون ہو تم۔"

"میں یہ گڑیا آپ کی خدمت میں پیش کرنے آئی ہوں۔" لڑکی بولی۔

"بکواس نہ کرو۔" استاد غرایا۔

جی بہت بہتر۔"

اسی وقت لڑکی نے گڑیا کا پیٹ ہاتھ آگے بڑھا کر دبا دیا۔ اس میں سے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر نکلی اور سیدھی اچکوں کی طرف گئی۔ تین چار اچکوں کے منہ سے چیخیں نکلیں اور وہ فرش پر لڑھک گئے۔"

""ارے۔ ارے۔ یہ کیا۔"

"اس گڑیا کے علاوہ بھی ہمارے پاس کچھ ہے۔" ایک اور آواز آئی۔ اس مرتبہ ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ حیرت کی وجہ سے ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

"یہ دیکھئے..... یہ ایک پنسل تراش ہے۔ یہ میں آپ لوگوں کے درمیان پھینکتا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے پنسل تراش اچکوں پر اچھال دیا۔ پنسل تراش ہلکی آواز کے

ساتھ زمین سے ٹکرایا ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا۔ اس پنسل تراش میں سے چکا چوند کر دینے والی روشنی نکلی جو ان کی آنکھوں کو خیرہ کر گئی۔

"ارے مر گئے۔ اُف میری آنکھوں کو کیا ہوا۔" کئی اچکے اپنی آنکھوں کو پکڑ کر چلانے لگے۔ استاد حیرت کا بُت بنا دیکھ رہا تھا۔

"آپ یہ چاکلیٹ کھائیے۔" ایک اور لڑکا اندر داخل ہو کر استاد سے بولا۔ ساتھ ہی اس نے ایک چاکلیٹ اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹا لیکن اتنی دیر میں چاکلیٹ کسی ننھے منے بم کی طرح پھٹ چکا تھا۔

استاد کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر زمین پر آرہا۔

"بہت خوب۔ اب تم ہاتھ اوپر اٹھادو۔" ایک نوجوان اندر داخل ہوا جس کے چہرے پر مونچھیں تھیں ہاتھ میں پستول۔ استاد کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ اس کے جو ساتھی ہوش میں تھے، ان کے ہاتھ بھی اوپر اٹھ گئے۔

ساجد حیرت کا بت بنا کھڑا تھا۔

"کھیل ختم ہو گیا۔ ساجد اب تم فوراً سپاہیوں کو فون کر کے بلالو....."

"کون ہو تم۔" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"تمہارا دوست۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی مونچھیں اکھاڑ دیں۔

"ارے۔ جمشید تم....."

"ہاں اور یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔"

"حیرت ہے۔"

"حیران بعد میں ہو لینا۔ پہلے فون کر آؤ۔"

"میں ابھی فون کر کے آتا ہوں۔

☆☆☆

استاد کون؟

ان سب کو ہتھکڑیاں لگائی جا چکی تھیں لیکن وہ سب ابھی تک اسی حال میں تھے۔ تمام اچکے اب ہوش میں تھے۔ ساجد ابھی تک حیران تھا۔ یہ سب کچھ اس طرح آناً فاناً میں ہوا تھا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔

"اور اب۔ انسپکٹر ساجد میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ تم ان اچکوں کو بند کر دو یا ان کا اچار ڈال لو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔"

"میرے ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ خیر تمہیں سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔ تم اچکوں کے سردار کو دیکھ رہے ہو۔ اسے پہچانتے ہو۔"

"نہیں۔" ساجد نے کہا۔

"تمہارا اسسٹنٹ کہاں ہے۔ پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ وہ نہیں آیا۔"

"وہ نہیں ملا۔ تھانے میں بھی نہیں تھا۔ نہ گھر ملا......"

"وہ مل بھی کیسے سکتا ہے۔ وہ تو یہاں موجود ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"جی ہاں۔ یہ رہے وہ حضرت۔" انسپکٹر جمشید نے استاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا!" وہ ایک ساتھ چلائے۔

"ہاں۔ اس کے چہرے سے عینک اتار دو۔ خود ہی دیکھ لو گے۔"

ساجد نے آگے بڑھ کر اس کی عینک کھینچ لی...... اور پھر وہ سب حیران رہ گئے۔ طاہر ان کے سامنے تھا۔

"اب یہ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ اچکوں کو میری آمد کا کیسے پتا چل گیا تھا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اب۔ اب تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہے۔"

"ہاں۔ دراصل مجرم تو شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ ساتھ رہا ہے۔ اسے ہماری ہر بات کا پتا چلتا رہا ہے۔ جب میں نے دو اچکوں کی نگرانی شروع کرائی تو اس نے انہیں اس عمارت میں قید کر دیا۔ اور اس طرح ہمارے راستے بند ہو گئے۔ پھر بھی یہ مجھ سے ڈر گیا اور اس نے وارداتیں ہی رکوا دیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک دن ہم مون لائٹ ہوٹل کے کمرے میں باتیں کر رہے تھے۔ جب تم اٹھ کر جانے لگے اور تم نے ایک دروازہ کھولا تو یہ دروازے پر موجود تھا۔ تم اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ کیونکہ تم نے تو اس کی ڈیوٹی ٹیکسیوں کے اڈے پر لگا دی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے۔"

"اور پہلے دن۔ جب مون لائٹ ہوٹل میں اچکوں نے چھ سات لوگوں کی جیبیں کاٹیں تو یہ ہوٹل کے باہر موجود تھا۔ جب اس کے ساتھی ہوٹل سے باہر نکل گئے تو یہ کانسٹیبلوں کو لے کر اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ خود ہی ان کو بچ کر بھاگنے کے مواقع دیتا تھا تو اچکے پکڑے کیسے جا سکتے تھے۔ پھر ہمارے کمرے سے اپنا ہتھوڑا اڑانے والا بھی یہی تھا۔"

"ہوں۔ اب سمجھا کہ کوئی اچکا پکڑا کیوں نہیں جاتا تھا، لیکن ایک بات سمجھ

میں نہیں آئی۔ تم کو تو میں نے گاڑی میں سوار کر دیا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے گاڑی چلی بھی گئی تھی۔" ساجد نے پوچھا۔

"ہاں! لیکن ہم وولٹ پورے اگلے اسٹیشن پر ہی اتر گئے تھے۔" انسپکٹر جمشید ہنسے۔

"بھئی تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ مگر...... میری سمجھ میں۔ یہ گڑیا۔ پنسل تراش اور وہ چاکلیٹ نہیں آئے۔" ساجد نے ان تینوں کھلونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جواب پھر ان تینوں کے ہاتھوں میں تھے۔

"بھئی۔ میرے ایک دوست ہیں۔ پروفیسر داؤد......"

"پروفیسر داؤد۔ یہ تو ہمارے ملک کے سائنسدان ہیں۔" ساجد نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔ وہ ان بچوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ ضد کر کے ان سے ایسی چیزیں بنوا لیتے ہیں۔ وہ بھی ان کی خوشی کی خاطر بنا دیتے ہیں۔"

"بہت خوب۔ یہ تینوں کھلونے حیرت انگیز ہیں۔"

"اچھا بھئی۔ اب تو ہمیں اجازت ہے نا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں۔ اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ کچھ دن ہمارے ہاں رہنا ہوگا۔"

"کیوں بچو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"جو انکل کا......!" تینوں ایک ساتھ بولے، ساجد اور انسپکٹر جمشید ہنس پڑے......"

------------☆☆------------